یکم و ۱۶ جنوری ۲۰۲۴ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۷ ۔ شمارہ نمبر: ۱۔۲

پندرہ روزہ

معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

افغانستان میں امریکا کی ضرورت

Kathy Gannon

افغانستان کی بدقسمتی کہ یہ وہ سرزمین ہے جہاں امریکا نے اپنی تاریخ کی سب سے طویل جنگ لڑی ہے لیکن کتنی ستم ظریفی ہے کہ اسی افغانستان کے بارے میں آج امریکا میں عوامی سطح پر کوئی بات کرنے والا موجود نہیں ہے۔ اس بات کو سمجھنا اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک جنگ کی جگہ کوئی دوسری جنگ اور ایک تنازع کی جگہ کوئی دوسرا تنازع جنم لے لیتا ہے۔ افغانستان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اس کی تاریخ کو بھی اس وقت اسی تلخ حقیقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور یہی کچھ ہوتا نظر آتا ہے۔

۱۹۷۹ء سے شروع کر لیں، جب سے افغانستان ایک دائمی شورش کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ جب سوویت یونین نے افغانستان کے خلاف فوجی مداخلت کر کے ایک کھلی جارحیت کا ارتکاب کیا تھا تو اس کے نتیجے میں لاکھوں افغان باشندوں کو اپنی جانیں بچانے کے لیے اپنے گھر بار یا اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ممالک میں پناہ لینا پڑی تھی۔ افغانستان کی بدقسمتی کہ یہاں فوجی مداخلت ہوتی اور ختم ہوتی رہی اور اس کا انجام ہمیشہ ایک ناکامی کی صورت میں ہی دیکھنے کو ملا۔ افغانستان ہو، افغان شہری ہوں یا اس کے ہمسایہ ممالک، ان سب کو ہی افغان جنگوں کے سنگین نتائج بھگتنا پڑے ہیں۔ آج امریکا کی طویل ترین جنگ اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔ افغان دارالحکومت کابل میں قائم امریکی سفارت خانہ آج خالی اور ویران پڑا ہے اور ہر روز اس تلخ حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے کہ یہ امریکا تھا جو ۲۰۲۱ء میں افغانستان سے اپنی اور اتحادیوں کی فوجیں نکال لینے کے بعد یہ چاہتا تھا کہ وہ افغانستان اور وہاں برسر اقتدار آنے والی طالبان حکومت کو دنیا بھر سے الگ تھلگ کر دے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے واشنگٹن کی یہ پوری کوشش رہی کہ وہ طالبان حکمرانوں پر دباؤ ڈالے کہ وہ اپنے نظریات میں نرمی اور اعتدال پسندی پیدا کریں۔ خواتین کے حقوق کے حوالے سے اپنے وعدے پورے کریں۔ افغان حکومت میں غیر طالبان گروہوں کو بھی شمولیت کا موقع دے کر اس میں توسیع کریں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی طرف بھی سنجیدہ توجہ دیں۔ جب یہ گروپ پہلی مرتبہ افغان اقتدار پر قابض ہوا تھا تو اس وقت بھی امریکی حکومت کا یہ حربہ بری طرح بیک فائر کر گیا تھا اور آج بھی مغربی ممالک کے خالی سفارتخانے افغان طالبات کو سکولوں میں واپس لانے یا ورک فورس میں افغان خواتین کی شمولیت کرانے میں بری طرح ناکام نظر آتے ہیں۔ بلکہ افغانستان کو دنیا سے الگ تھلگ کرنے کی کوشش میں صرف افغان شہری دنیا سے کٹ کر رہ گئے ہیں اور ان کی اکثریت اب بدترین قسم کی تنہائی اور بے بسی محسوس کرتی ہے۔ اب یہ اعتراف کرنے کا وقت آ گیا ہے کہ ماضی کی افغان پالیسیاں ناکام ہو چکی ہیں، اس لیے امریکا اور اس کے اتحادیوں کو اپنا لائحہ عمل اب تبدیل کر لینا چاہیے اور بڑے پیمانے پر اس میں شامل ہونا چاہیے جس کے نتیجے میں افغان حقائق کے بارے میں بہتر افہام و تفہیم پیدا ہو سکے گی۔

یہ حقیقت ہے کہ آج بھی افغانستان کو انسانی امداد کی شکل میں سب سے زیادہ حصہ امریکا ہی ڈالتا ہے، اس لیے اسے چاہیے کہ وہ ایک بار پھر افغانستان اور اس کے چار کروڑ شہریوں کے پاس واپس آئے۔ امریکا کو چاہیے کہ وہ کابل میں اپنا سفارتخانہ دوبارہ کھولے اور تمام افغان سوسائٹی کے ساتھ مل کر کام کرنے کا آغاز کرے۔ افغانستان کو بھی یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ امریکا اور دیگر مغربی ممالک وہاں موجود ہیں اور وہ ان پر انحصار کر سکتا ہے۔ میں بطور صحافی کئی عشروں تک افغانستان میں خدمات انجام دے چکی ہوں اور میں نے اپنی آنکھوں سے افغانستان کو کئی جنگوں کا سامنا کرتے ہوئے دیکھا ہے اور پے در پے کئی پالیسیوں کی ناکامی کے نتائج کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ کس طرح بہت سے ممالک اور عالمی تنظیمیں افغانستان کے انتہائی تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں کو عجلت میں تنہا چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں نے ۲۰۲۱ء میں امریکا کے آخری ہوائی جہاز کو کابل ایئرپورٹ سے پرواز کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا، جب اس جنگ کا ایک احمقانہ اختتام ہوا تھا اور طالبان نے ایک بار پھر افغانستان

اندرونی صفحات پر

- یوکرین جنگ کے مناظر
- پاکستان میں ای کامرس کا مستقبل؟
- ۲۰۲۳ء انسانیت کے لیے ایک اچھا سال؟
- مصنوعی ذہانت
- کیا خلا سے زمین پر بجلی منتقل کی جا سکتی ہے؟
- صلاحیت کے حصول میں کون آگے؟
- چین: آبادی میں کمی کا سنگین مسئلہ
- نظریاتی تاریخ کا اختتام
- ایران امریکا پر اکسی جنگ

میں اقتدار سنبھال لیا تھا۔ میں حیران تھی کہ کیا دنیا کبھی اس قابل ہو سکے گی کہ وہ افغانستان جیسے حیران کن ملک کو دیکھ اور سمجھ سکے۔ اسے صرف افغان اشرافیہ اور بیرونِ ملک مقیم افغان ہی نظر نہ آئیں بلکہ دیہات اور شہروں میں بسنے والے افغان، کھیتوں اور میلوں تک پھیلے سنگلاخ پہاڑوں پر بسنے والے افغان عوام بھی نظر آئیں۔

جب طالبان نے ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۱ء کے دوران افغانستان پر حکومت کی تھی تو امریکا، اقوام متحدہ اور دیگر عالمی ممالک نے ان کے ساتھ انتہائی سخت رویے کا مظاہرہ کیا تھا۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ امریکا اور دیگر عالمی ممالک ان کی حکومت کو تسلیم کر لیں تو وہ فلاں فلاں شرائط پوری کریں۔ طالبان حکومت کو یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ وہ افغان لڑکیوں کی سکول و کالج تعلیم کا بندوبست کریں، منشیات کی کاشت اور پیداوار کی روک تھام کریں اور اسامہ بن لادن کو اپنے ملک میں پناہ دینے کے بجائے اسے جلاوطن کر دیں، جو طالبان کے ۱۹۹۶ء میں افغانستان میں برسر اقتدار آنے سے بھی پہلے سے وہاں مقیم تھا۔ لیکن امریکا اور اقوام متحدہ کی طرف سے لگائی جانے والی پابندیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ افغانستان پوری دنیا سے کٹ کر رہ گیا اور یوں ان طالبان رہنماؤں کے لیے بھی راستے مسدود ہو گئے جو کسی نہ کسی طرح دنیا کے ساتھ مل کر چلنے کی خواہش رکھتے تھے اور اپنے ملک کی ترقی اور مستقبل کے حوالے سے ایک ٹھوس وژن رکھتے تھے جبکہ ان کے نظریات امریکا اور دیگر یورپی ممالک کے دارالحکومتوں کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں بھی رکھتے ہوں گے جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کی سکول کی تعلیم بھی شامل تھی۔

سب سے سنجیدہ پہلو یہ تھا کہ اس طالبان حکومت میں بعض ایسے رہنما بھی موجود تھے جو اپنی سرزمین پر غیر ملکی عناصر اور جنگجوؤں کی موجودگی کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ جیسا کہ میں نے ان دنوں بھی یہ رپورٹ کیا کہ اس وقت کے نائب وزیر داخلہ محمد خاکسار نے مجھے بتایا تھا کہ امریکا پر نائن الیون حملوں سے پہلے میں نے ہمسایہ ملک پاکستان میں ایک امریکی سفارت کار اور سی آئی اے کے حکام سے رابطہ قائم کیا تھا کہ غیر ملکی جنگجوؤں کو یہاں سے نکالنے میں طالبان حکومت کی حمایت کی جائے مگر ہماری اس پیشکش کو ڈھٹائی سے مسترد کر دیا گیا تھا۔ پاکستان کے شمال مغربی شہر پشاور میں اس وقت تعینات امریکا کے نائب قونصل جنرل گریگری مارچز نے بعد میں میرے ساتھ ملاقات کے دوران اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ ''ہاں! میں نے اور سی آئی اے کے ایک عہدیدار پیٹر میکلیوین نے افغانستان کے نائب وزیر داخلہ محمد خاکسار کے ساتھ ملاقات کی تھی'' اور یوں محمد خاکسار کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کر دی۔

جب سوویت فوج کا افغانستان سے انخلا مکمل ہوا تو امریکا نے اس کے بعد کے برسوں میں اس طرف کوئی توجہ نہیں دی اور ایک عشرے بعد تو کابل میں اپنا سفارت خانہ بھی بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکا کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہاں کیا کھچڑی پک رہی تھی اور یوں افغانستان کے حالات اس ڈگر پر چل نکلے جس کا نتیجہ امریکا پر نائن الیون حملوں کی صورت میں برآمد ہوا۔ گزشتہ دو برسوں سے بھی امریکا افغانستان کے حوالے سے اسی طرح کی پالیسی پر کاربند نظر آتا ہے۔ اس نے کابل میں اپنی سفارتی واپسی کا باب بند کر رکھا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ وہ اس وعدے کی صورت میں دباؤ ڈال سکتا ہے کہ طالبان حکومت کو امریکا اور عالمی برادری صرف اسی صورت میں تسلیم کرے گی جب وہاں لڑکیوں کے لیے تعلیم کے دروازے کھولے جائیں گے اور خواتین پر عملی زندگی میں حصہ لینے کے ضمن میں لگائی گئی پابندیوں میں نرمی کی جائے گی۔ اور ایک مرتبہ پھر دباؤ کی یہ امریکی پالیسی بری طرح ناکامی سے دوچار نظر آ رہی ہے۔ ۲۰۲۱ء سے، جب سے میں طالبان تحریک کے حوالے سے رپورٹنگ کر رہی ہوں، میں نے دیکھا ہے کہ جن طالبان رہنماؤں پر زیادہ پابندیاں عائد کی گئی ہیں وہ اتنے ہی زیادہ کھل کر سامنے آ گئے۔ وہ ان پابندیوں کی آڑ میں یہ کہہ کر حکومتی امور پر اپنی گرفت مضبوط کرنے اور اس کا سیاسی فائدہ اٹھانے میں کامیاب رہے ہیں کہ ان کے ملک کو دانستہ عالمی تنہائی کا شکار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو افغان رہنما عالمی برداری کے ساتھ مل کر چلنے کی خواہش رکھتے ہیں اور جو سماج کی ترقی میں خواتین کے ایک مثبت کردار کے حامی ہیں، انہیں اس کی بھاری قیمت چکانا پڑ رہی ہے۔

امریکا نے مالی لحاظ سے افغانستان کے لیے ایک فراخدلانہ تعاون کا مظاہرہ کیا ہے اور طالبان حکومت کے قیام کے بعد بھی انسانی بنیادوں پر ایک کثیر امداد فراہم کرنے کا بندوبست کیا ہے۔ امریکا آج بھی افغانستان کے لیے مالی وسائل کی فراہمی کا سب سے بڑا ڈونر ہے۔ جب سے اس نے افغانستان کو چھوڑا ہے اب تک اس پر دو ارب ڈالر سے زائد کی امدادی رقوم خرچ کر چکا ہے۔ (عین اسی وقت امریکا اور یورپی یونین نے طالبان کی واپسی کے بعد سے افغانستان کے نو ارب ڈالرز کے اثاثے منجمد بھی کر رکھے ہیں) لیکن صرف انسانی بنیادوں پر ملنے والی امدادی رقوم سے ہی افغانستان میں ترقی کے عمل کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ افغانستان میں عوامی سطح پر طالبان مخالف تحریک کے بارے میں یہی تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ وہی بدنامِ زمانہ وار لارڈز ہیں جن پر جنگی جرائم کے الزامات ہیں اور یہ وہی سابق جرنیل ہیں جنہوں نے ۲۰۰۱ء میں افغانستان پر امریکی جارحیت کے بعد چارج سنبھال لیا تھا۔ ان میں سے کچھ تو ایسے بھی ہیں جن پر افغان شہریوں کے خلاف گھناؤنے جرائم میں ملوث ہونے کے الزامات ہیں گو کہ انہوں نے ان الزامات کی تردید کی ہے۔ امریکا نے ان رہنماؤں کے ساتھ مل کر کام بھی کیا ہے لیکن یہ لوگ افغان مسئلے کا حصہ ہیں، اس کا حل نہیں ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکا افغان طالبان کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔ امریکی حکام نے قطر میں طالبان رہنماؤں سے ملاقات بھی کی ہے، جہاں اس گروپ نے اپنا ایک سیاسی دفتر قائم کر رکھا ہے اور جہاں امریکا کا سفارتی مشن برائے افغانستان بھی قائم ہے۔ واشنگٹن کے خصوصی سفارت کار تھامس ویسٹ امریکا کی افغان پالیسی کا عوامی چہرہ ہیں۔ انہوں نے قطر میں طالبان رہنماؤں کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم اور انسانی بنیادوں پر امداد کی فراہمی جیسے موضوعات پر مذاکرات بھی کیے ہیں اور وہ اس ضمن میں افغانستان کے ہمسایہ ممالک، مشرقِ وسطیٰ اور یورپی ممالک کے ساتھ بھی بات چیت کرتے رہتے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ یہ فاصلاتی نوعیت کا تعاون ہے۔ یہ ایک ایسی حکمتِ عملی ہے جس میں مخصوص افغانوں کو شریکِ عمل کیا جاتا ہے جن میں کابل کی اشرافیہ، بیرونِ ملک مقیم افغان تارکینِ وطن اور سابق افغان سرکاری حکام شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکی حکام کو اس بات کا کوئی ادراک یا سمجھ نہیں ہے کہ افغانستان کے زمینی حقائق کس نوعیت کے ہیں۔ طالبان حکومت کے قیام کے بعد سے اقوام متحدہ نے افغانستان میں اپنا وجود مسلسل برقرار رکھا ہے اور اس عمل میں جاپان، چین، روس اور مشرقِ وسطیٰ کے بیس سے زائد ممالک بھی شامل ہیں جنہوں نے گزشتہ دو برسوں سے وہاں اپنی سفارتی موجودگی کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ جب تک امریکا اور دیگر یورپی ممالک بھی ایسا ہی نہیں کرتے، اس وقت تک افغانستان میں ایسے لوگ موجود رہیں گے جو خود

باقی صفحہ نمبر ۱۵ <<<

یوکرین جنگ کے مناظر

Carlotta Gall - Oleksandr Chubko and Olha Konovalova

جب ایک یوکرینی فوجی دریائے نپرو کے مشرقی کنارے پر ہونے والی ہولناک جنگ کی رُوداد سنا رہا تھا تو اس کی آواز میں ایک عجیب سی کپکپاہٹ تھی۔ وہ اس جنگ میں شدید زخمی ہوگیا تھا۔ یوکرینی فوجی نے، جس کا نام میکسم تھا، مجھے بتایا کہ ''ہم رات کے وقت پانی میں بیٹھے تھے کہ اچانک ہم پر چاروں طرف سے گولہ باری شروع ہوگئی۔ میرے ساتھی میری آنکھوں کے سامنے مر رہے تھے''۔ یوکرین کی میرین کور پچھلے دو مہینوں سے روسی فوج سے اپنا مقبوضہ علاقہ واپس لینے کے لیے دریائے نپرو کے جنوب میں خیرسن ریجن میں مسلسل حملے کر رہی تھی۔ یہ آپریشن یوکرین کی فوج کی ایک تازہ ترین کوشش تھی جو وہ جنوب میں روسی فوج کا دفاعی حصار توڑنے کے لیے جوابی حملے کی صورت میں کر رہی تھی تاکہ پونے دو سال سے جاری اس جنگ کا پانسہ پلٹ سکے۔ جن فوجیوں اور میرینز نے دریائے نپرو کو عبور کرنے میں حصہ لیا تھا، انہوں نے بتایا کہ یہ ایک وحشیانہ مگر بے سود حملہ تھا کیونکہ یوکرینی فوجیوں کو دریائے نپرو کی تیز لہروں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا یا دوسری طرف پہنچنے سے پہلے انہیں مسلسل پانی میں رہنا پڑ رہا تھا۔

جنگ کی صورتِ حال اس قدر خوفناک تھی کہ اس میں حصہ لینے والے نصف درجن سے زائد فوجیوں نے اپنے انٹرویوز میں بتایا کہ زیادہ تر مقامات پر ہمارے پاس کھڑے ہونے کے لیے بھی جگہ نہیں تھی۔ ہماری پہلی پیش قدمی ہی دلدلی جزیروں میں سے تھی جو چھوٹے ندی نالوں کے ساتھ جڑے ہوئے تھے اور آس پاس موجود چراگاہیں بھی دلدل بنی ہوئی تھیں جبکہ بم پھٹنے سے بننے والے گڑھے دریا کے پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ فوجیوں اور میرینز نے بعض سکیورٹی وجوہات کی بنا پر اپنے نام اور شناخت ظاہر کرنے سے انکار کر دیا اور صرف اپنا پہلا نام ہی بتایا۔ فوجی کمانڈرز نے بھی میڈیا کی ان تمام درخواستوں کو مسترد کر دیا تھا کہ انہیں خیرسن ریجن میں فوجی یونٹس کا دورہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ کئی فوجیوں نے بھاری تعداد میں ہونے والے جانی نقصان پر صحافیوں کے سامنے اپنی تشویش کا اظہار بھی کیا تھا، تاہم انہوں نے جو کچھ ہمیں بتایا تھا اس سے حکام کی طرف سے اپنے جوابی حملے کی پیش رفت کے بارے میں ایک امید افزا تاثر ابھر رہا تھا۔

جنرل اسٹاف آف دی آرمڈ فورسز آف یوکرین نے بتایا کہ ان چند فوجیوں کی طرف سے لگائے جانے والے الزامات کے بارے میں فوری طور پر کسی قسم کا ردِعمل دینا ممکن نہیں ہے تاہم مناسب وقت آنے پر اس حوالے سے وہ سرکاری مؤقف ضرور دیں گے۔ سب سے خونریز جنگ دریائے نپرو کے مشرقی کنارے پر خیرسن شہر سے بیس میل کے فاصلے پر کرنکی نامی ایک گاؤں میں ہوئی تھی جہاں یوکرینی فوجیوں نے ماہی گیروں کے گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی پٹی پر قبضہ کر لیا تھا اور یہ واحد جگہ تھی جہاں وہ کسی حد تک اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ لیکن اس علاقے کی فوٹیج اور ڈرونز کی مدد سے لائیو سٹریم سے، جسے نیویارک ٹائمز کی ٹیم نے بھی دیکھا تھا، روسی فضائیہ کی شدید بمباری کی بات کی تصدیق ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے ماہی گیروں کے گھر تباہ ہوگئے تھے اور دریائے نپرو کا کنارہ ایک دلدل میں بدل گیا تھا۔ یہاں لگے درخت بھی جڑوں سے اکھڑ گئے تھے۔

ایک فوجی، جس کا نام اولیکسی تھا اور وہ اکتوبر میں کرنکی گاؤں میں جنگ لڑ چکا تھا اور زخمی یوکرینی فوجیوں کو میدانِ جنگ سے نکالنے میں مدد دینے کے لیے کئی مرتبہ اس علاقے میں آ جا چکا تھا، اس نے بتایا کہ مشرقی کنارے پر آنے والے تازہ دم فوجیوں کو مرنے والے فوجیوں کی لاشوں کے اوپر سے گزر کر جانا پڑ رہا تھا جو اس کیچڑ میں کچلی ہوئی پڑی تھیں۔ ڈپٹی کمپنی کمانڈر ولادیمیر، جس نے اسی مہینے اپنے مرنے والے جوانوں کے جنازوں میں شرکت کی تھی اور اپنا تعارف صرف ڈینس کے نام سے کرایا تھا اس نے ہمیں بتایا کہ ''کچھ میرینز کی لاشیں تو دو مہینے سے اس علاقے میں پڑی ہوئی ہیں کیونکہ بھاری گولہ باری کی وجہ سے انہیں وہاں سے نکالنا ممکن نہیں تھا۔ بایاں کنارہ زیادہ مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ جن لوگوں نے یہاں جنگ لڑی ہے وہ قوم کے حقیقی ہیرو ہیں اور ان جوانوں کے اندر بے پناہ قوتِ ارادی اور حوصلہ پایا جاتا ہے''۔

جب سے یہ تاثر ابھر رہا ہے کہ یوکرین کا جوابی حملہ بری طرح ناکام ہوگیا ہے تو امریکا اور اس کے اتحادی یورپی ممالک نے یوکرین کی امداد میں کٹوتی کا عندیہ دینا شروع کر دیا ہے، جب سے دریائے نپرو کو عبور کر کے روسی فوج پر جوابی حملہ کیا گیا تھا اس کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا جا رہا تھا اور یہ عندیہ دیا جا رہا تھا کہ یوکرینی فوج روس کے خلاف پیش قدمی میں کامیاب ہوجائے گی۔ یہ بھی امید کی جا رہی تھی کہ یوکرینی فورسز روس کے سپلائی روٹس اور جنوبی علاقے پر قبضے میں بریک تھرو کرنے میں کامیاب ہوں گی۔ یوکرین نے اس نئی میرین کور کو اسی سال تشکیل کیا ہے، جس میں شامل کرنے کے لیے کئی نئے بریگیڈ بنائے گئے تھے اور اس کور کو روسی فوج کے قبضے سے یوکرین کے مقبوضہ علاقے آزاد کرانے کا کام سونپا گیا تھا۔

جب سے روس نے یوکرین پر جنگ مُسلّط کی ہے اس وقت سے یوکرینی حکام اپنا ایک مثبت بیانیہ برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ ملک کے اندر بھی اپنے عوام کا مورال بلند رکھا جاسکے اور بیرونی دنیا میں بھی یوکرین کی حمایت جاری رکھی جائے۔ اسی حکمتِ عملی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جنگ میں مارے اور زخمی ہوجانے والے فوجیوں کے بارے میں کوئی اعداد و شمار جاری نہیں کیے جاتے اور نہ ہی یوکرینی فوج کو ہونے والی ناکامیوں کے بارے میں کسی قسم کی تفصیلات جاری کی جاتی ہیں۔

دریائے نپرو کے کیس میں یوکرین کے صدر ولادیمیر زیلنسکی اور دیگر اعلیٰ حکام نے حال ہی میں میڈیا کو یہ بتایا ہے کہ یوکرینی میرینز نے دریا کے مشرقی کنارے پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی پوزیشن مضبوط کر لی ہے۔ یوکرین کی وزارتِ خارجہ نے پچھلے مہینے اپنا ایک سرکاری بیان پوسٹ کیا تھا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ انہوں نے روسی افواج سے کئی علاقوں کا قبضہ چھڑوا کر وہاں مضبوط قلعہ بندیاں کر لی ہیں۔ تاہم ان علاقوں میں موجود فوجیوں اور میرینز کا کہنا ہے کہ سرکاری بیانات میں کیے جانے والے دعووں میں بڑی حد تک مبالغہ آرائی سے کام لیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں اولیکسی کا کہنا ہے کہ ''ہماری ایسی کوئی پوزیشنز نہیں ہیں۔ آبزرویشن پوسٹ یا پوزیشن کے طور پر وہاں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ وہاں اپنے قدم مضبوط کرنا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ وہ سارا علاقہ ایک دلدل میں بدل چکا ہے، اس لیے وہاں جنگی آلات کی نقل و حرکت ہی ممکن نہیں تو قدم کیسے مضبوط کیے جاسکتے

ہیں۔ اسے تو بقا کی جنگ کہنا بھی مناسب نہیں، اسے ایک خودکش مشن ہی کہا جاسکتا ہے''۔

الیکسی نے بتایا کہ کمانڈر کی ناقص تیاری اور لاجسٹکس نے اس کی بٹالین کا نام ونشان تک مٹا دیا۔ زخمی فوجیوں کو محض اس لیے پیچھے چھوڑ کر آنا پڑا کیونکہ انہیں لانے کے لیے کشتیاں دستیاب نہیں تھیں اور حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہو چکے تھے کہ جوانوں کا مورال ختم ہو کر رہ گیا تھا اور وہ ایک دوسرے کو سپورٹ کرنے کے قابل بھی نہ رہے۔ الیکسی نے مزید بتایا کہ جو لوگ بھی پیچھے رہ گئے تھے، وہ نفسیاتی طور پر تیار نہیں تھے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے تھے۔ جو کمانڈر انہیں بھیج رہے تھے انہوں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ الیکسی نے اس قدر جانی اور مالی نقصان پر پریشانی کے عالم میں نیویارک ٹائمز کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ اس کی دی گئی معلومات کو اپنے اخبار میں شائع کر سکتے ہیں۔ اس نے مشرقی محاذ پر لڑی جانے والی دو گھمسان کی لڑائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ''میں نے ایسی بری صورتحال تو بخمت اور سولینڈر میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ تو ایک لاحاصل جنگ ہے''۔

یوکرین کنٹرول میپ پر دریائے نیپرو کے کناروں کے ساتھ ساتھ روسی فضائیہ کی شدید بمباری کی نشاندہی کی گئی تھی۔ محاذ کے دونوں اطراف میں وڈیو فوٹیج کی مدد سے جن زمینی لوکیشنز کی نشاندہی کی گئی تھی، الیکسی کے بیان سے اس بات کی تصدیق ہو رہی تھی۔ دریائے نیپرو کے چالیس میل کے پاٹ کے ساتھ ساتھ کئی کراسنگ پوائنٹس پر روسی فضائیہ کے جنگی طیاروں کی بمباری کی اس نقشے میں نشاندہی کی گئی تھی۔ دوسری طرف ہمیں ملنے والی تفصیلات سے معلوم ہوا ہے کہ روسی فوج کو بھی اس لڑائی میں شدید ہزیمت اور جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس نقشے میں یوکرینی فوج کے توپ خانے، راکٹس اور ڈرونز کی مدد سے دریائے نیپرو کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ روسی فوج کے تمام اہم ٹھکانوں پر پے در پے ہونے والے حملوں کی نشاندہی بھی کی گئی تھی۔ خیرسن شہر بار بار روسی فوج کے حملوں کا نشانہ بن رہا ہے مگر یہاں یوکرینی توپ خانے کی مسلسل جوابی گولہ باری کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔

چودھویں سپیریٹ رجمنٹ کے ڈپٹی کمانڈر چھتیس سالہ یویہن کرس، جو دریا کے اس پار روسی ٹھکانوں پر اپنے یونٹس کے ڈرون حملوں کی نگرانی کر رہے تھے، نے بتایا کہ ''عام طور پر ہم اپنے شکار کی تلاش میں ہوتے ہیں''۔ تاہم اس نے بتایا کہ بعض سکیورٹی وجوہات کی بنا پر میں اپنی لوکیشن کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ کرس، جسے فوج میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے کا، کہنا تھا کہ ''ہمارا بڑا ہدف روسی توپ خانہ اور اپنے آپریشنز کا دفاع ہوتا ہے۔ ہم نے دو مہینے کے آپریشن کے بعد اس علاقے میں موجود روسی یونٹس اور لانگ رینج توپ خانے کو یہاں سے بھگا دیا ہے۔ روسی فوجی دن کے وقت زیادہ تر چھپے رہتے ہیں اور محض رات کے وقت ہی نقل وحرکت کرنے پر مجبور ہیں''۔

کمانڈر کرس ۲۰۱۴ء سے ہی ایک والنٹیئر ملٹری گروپ کی قیادت کر رہا ہے، جسے اس کے واچ ڈاگ شدت پسند دائیں بازو کے نام سے پکارتے ہیں؛ تاہم ۲۰۱۶ء میں اس گروپ کو یوکرین آرمی کی سپیشل آپریشنز فورس میں ضم کر دیا گیا۔ کرس کا مزید کہنا تھا کہ ہمارے میرینز کو سب سے زیادہ مشکلات میں سے گزرنا پڑا ہے لیکن یوکرینی فوج کے حملوں نے روسی کمانڈروں کے اوسان خطا کر دیے ہیں اور وہ اپنے دفاع کو مضبوط کرنے کے لیے عقب سے زیپوری ژیڑیا کے فرنٹ سے ایک ایئر بورن یونٹ کو آگے لانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ روسی کمانڈر اس بات پر بہت خوف زدہ نظر آتے ہیں کہ یوکرینی فوج اسی مہینے یا اس سال موسم بہار یا موسم گرما میں اس علاقے میں اپنی فوجی قوت میں اضافہ کر لے گی تاکہ روسی فوج کے قبضے سے دریا کے مشرقی کنارے کے اپنے مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرائے۔ کرس نے یہ بھی بتایا کہ وہ انٹیلی جنس کے دیگر ذرائع کے علاوہ روسی کمیونی کیشنز کے ریڈیو کو بھی انٹرسیپٹ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر یوکرینی فوج تھوڑا سا علاقہ بھی روسی قبضے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئی تو وہ اس پوزیشن میں آ جائے گی کہ کریمیا کی طرف روسی فوج کی فراہمی کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر سکے۔ مگر اب دریا کے اس پار آپریشنز میں ساری توجہ نہ صرف کسی بڑے بریک تھرو پر مرکوز تھی بلکہ پوری کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ روسی فوج کو گھیر کر جتنے بھی روسی فوجیوں کو قتل کیا جا سکتا ہے، انہیں قتل کر کے روس پر دباؤ بڑھایا جائے۔

میرین میکسم، جو نومبر میں کرنکی کی جنگ میں شدید زخمی ہو گیا تھا، اس وقت اسپتال میں داخل ہے اور تیزی سے روبصحت ہو رہا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ روسی فضائیہ، ٹینکوں، توپ خانے اور مارٹر گنوں سے حملہ اتنا شدید تھا کہ اس کی پلاٹون بیسمنٹ سے باہر نکل کر پیش قدمی ہی نہ کر سکی۔ یوکرینی فوجی روسی حملوں سے بچنے کے لیے بیسمنٹ میں پناہ لیے بیٹھے تھے۔ جب ایک فضائی حملے میں یوکرین کے تین فوجی مارے گئے تو اس کی پلاٹون کو حکم دے دیا گیا کہ وہ فوری طور پر یہ جگہ خالی کر کے کسی اور محفوظ جگہ پر منتقل ہو جائے۔ چنانچہ اسے انتہائی مشکل حالات میں تباہ کن پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ جب یوکرینی فوجیوں نے رات کی تاریکی میں چھپتے ہوئے دریائے نیپرو کے کنارے کی طرف جانے کی کوشش کی تو روسی فوج نے ان پر شدید فائرنگ شروع کر دی اور آخر میں صرف اتنا بتایا گیا کہ انہیں یہاں مزید تین گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا جونہی کوئی کشتی دستیاب ہوئی وہ انہیں وہاں سے پک کرنے کے لیے بھیج دی جائے گی۔

میکسم نے بتایا کہ ہمارے چاروں طرف دلدلی علاقہ تھا جہاں بم پھٹنے سے جگہ جگہ گڑھے بن گئے تھے جو دریا کے پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ ایسے میں وہاں نقل وحرکت انتہائی مشکل تھی۔ ہمارے پاس اور کوئی چوائس نہیں تھی۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ پانی میں بیٹھ کر ہی خود کو روسی فوج کی فائرنگ سے بچانا پڑ رہا تھا۔ میکسم نے یہ بھی بتایا کہ ''اس وقت تک ہر کوئی زخمی ہو چکا تھا کافی انتظار کے بعد محض ایک کشتی آئی اور وہ بھی کسی اور مشن پر تھی؛ چنانچہ جو فوجی شدید زخمی تھے، وہ صرف انہیں لے کر روانہ ہو گئی''۔

باقی فوجی دوسری کشتی کا انتظار کرتے رہے اور اسی دوران روسی طیاروں نے دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ شدید بمباری شروع کر دی، اس دوران تین گلائیڈ بم بھی گرائے گئے جن سے نصف ٹن بارود کے برابر دھماکے ہوئے جن کے بعد زمین میں مزید بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک اور کشتی پہنچی اور پانچ مزید زخمی فوجیوں کو لے کر روانہ ہو گئی۔ میکسم کو تیسری کشتی کی آمد کے لیے مزید چالیس منٹ انتظار کرنا پڑا۔ اس نے بتایا کہ ''بائیں کنارے پر تو مکمل صفایا ہو گیا تھا۔ آپ مرے تو نہیں تھے مگر زندہ بھی نہیں لگتے تھے''۔ ہماری پلاٹون کے دس جوان مر چکے تھے یا غائب تھے۔ کوئی ایک فوجی بھی ایسا نہیں بچا تھا جسے زخم نہ آئے ہوں۔

"Ukranian marines on 'Suicide Mission' in crossing the Dnipro River".
("The New York Times". Dec 16, 2023)

پاکستان میں ای کامرس کا مستقبل؟

ابو صباحت

پوری دنیا کی طرح پاکستان میں بھی کم وبیش ایک عشرے سے ای کامرس کا غلغلہ ہے۔ گھر بیٹھے کچھ منگوانا بہت اچھا لگتا ہے۔ بازار جانے، وہاں اپنی مرضی کی چیز تلاش کرنے میں آج کے انسان کو بہت الجھن محسوس ہوتی ہے۔ کسی بھی آن لائن اسٹور پر اپنی مرضی کی چیز تلاش کر کے اس کا آرڈر دینا بہت سہولت بھرا معاملہ لگتا ہے۔ اور یہ معاملہ ہے بھی سہولت والا۔

جب لوگوں میں آن لائن خریداری کا شوق بڑھا تو کئی ادارے میدان میں آ گئے۔ بہت سے نارمل اداروں نے بھی ای کامرس شروع کر دی یعنی آن لائن فروخت سے جُڑ گئے۔ اب پاکستان میں کم وبیش تمام ہی طرح کے آئٹم آن لائن اسٹورز کے ذریعے خریدے اور منگوائے جا سکتے ہیں۔

آن لائن خریداری آسان بھی ہے اور کبھی کبھی اس کے ذریعے انسان خاصی پریشانی سے بچ جاتا ہے مگر اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ کسی بھی چیز کو آن لائن خریدتے وقت اُس کی زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ اور کبھی کبھی معیار پر بھی سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ اب یہ شکایت عام ہوتی ہے کہ ویب سائٹ پر مال کچھ اور دکھایا جاتا ہے اور ڈلیوری کسی اور چیز کی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ مسابقت بڑھنے سے ہوا ہے۔

آن لائن خریداری یعنی ہوم ڈلیوری کا آرڈر دیتے وقت یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اس عمل میں کئی ادارے شریک ہو سکتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنا حصہ چاہیے۔ ایسے میں لازم ہے کہ زیادہ قیمت وصول کی جائے۔ یہی سبب ہے کہ آن لائن خریداری کی صورت میں عام خریداری کے مقابلے میں زیادہ ادائیگی کرنا پڑتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگ اس حوالے سے سوچنے پر مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کسی بھی چیز کو عام دکان سے خریدنے میں زیادہ فائدہ ہے۔

کورونا کی وبا کے دوران لاک ڈاؤن کے نتیجے میں آن لائن خریداری کا رجحان تیزی سے پروان چڑھا تھا۔ کھانے پینے کی اشیا تو اب بھی آن لائن منگوائی جا رہی ہیں اور یہ رجحان کمزور نہیں پڑ رہا تاہم دوسری بہت سی اشیا کی آن لائن خریداری کا رجحان کمزور پڑا ہے جس کے نتیجے میں مسابقت بڑھنے سے متعلقہ اداروں پر زیادہ دباؤ مرتب ہو رہا ہے۔

ایسے میں یہ خبر ای کامرس کے حوالے سے خاصی پریشان کن سمجھی جائے گی کہ پاکستان کی سب سے بڑی ای کامرس کمپنی کے سی ای او مستعفی ہو گئے ہیں۔ ادارے میں بڑے پیمانے پر چھانٹیوں کی تیاری کر لی گئی ہے۔ ''دراز'' میں کم وبیش ۲۵ فیصد چھانٹیاں کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سینئر مینجمنٹ کی شخصیات بھی شامل ہیں۔ سی ای او جارک مکلسن کے مستعفی ہونے کے بعد ادارہ لاگت میں کمی کے لیے کوشاں رہے گا۔ اس کے لیے چھانٹی کا راستہ اختیار کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔

جارک مکلسن نے اعلان کیا ہے کہ وہ کمپنی چھوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے آٹھ سال تک دراز کے لیے خدمات انجام دیں۔ عبوری مدت کے لیے چین کے بڑے ای بابا گروپ کی چھتری تلے کام کرنے والے لزاڈا گروپ کے سی ای او جیمز ڈونگ نے عبوری مدت کے لیے ''دراز'' کے سی ای او کا منصب بھی سنبھال لیا ہے۔ جارک مکلسن نے ملازمین سے مخاطب ہوتے ہوئے ایک بیان میں کہا کہ ادارے کو مضبوط بنانا میرا مشن تھا، میں اپنا کام مکمل کر کے نئی نسل کو ادارہ چلانے کی ذمہ داری سونپ رہا ہوں۔

مکلسن کا کہنا ہے کہ وہ ذاتی وجوہ کی بنیاد پر یہ منصب چھوڑ رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میں اب اپنے اہل خانہ کو زیادہ وقت دینا چاہتا ہوں اور اپنی اہلیہ کو ان کے کاروبار میں مدد دینا بھی میری بڑی خواہش اور ذمہ داری ہے۔ جارک مکلسن کا کہنا ہے کہ نئے عبوری سی ای او جیمز ڈونگ کی قیادت میں دراز کا تعلق اسی گروپ کے دیگر اداروں لزاڈا، ٹرینڈیول، علی ایکسپریس اور علی بابا سے بہت اچھا رہے گا۔

کمپنی کے ذرائع کا کہنا ہے کہ جارک مکلسن کی حیثیت علامتی تھی اور وہ علی بابا کی بڑی شخصیات کے فیصلوں کی تعمیل تک محدود تھے۔ دراز کا نیٹ ورک پاکستان، بنگلا دیش، میانمار، نیپال اور سری لنکا پر محیط ہے۔ ان تمام ممالک کی مجموعی آبادی ۴۵ کروڑ ہے یعنی یہ ایک اچھی مارکیٹ ہے۔

یہ قیاس آرائی بھی گردش کر رہی ہے کہ ترکیہ کی ایک کامرس کمپنی ٹرینڈیول نے دراز کو خریدنے کی بات کی ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ دراز کو اس وقت ٹرینڈیول ہی چلا رہی ہے جو چین کے علی بابا گروپ ہی کی ایک کمپنی ہے اور اس کی ملکیت ۸۶ فیصد تک ہے۔ جارک مکلسن کا رخصت ہونا بھی دراز کو ٹرینڈیول کے حوالے کرنے کے عمل کا حصہ ہو سکتا ہے۔

چھانٹی کے بارے میں پوچھے جانے پر مکمل تردید سے گریز کرتے ہوئے دراز انتظامیہ کے نمائندوں کا کہنا تھا کہ فوری طور پر ایسا کچھ نہیں کیا جا رہا۔ دوسری طرف ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پاکستان میں دراز سے ۲۵۰ سے ۴۰۰ ملازمین فارغ کیے جا سکتے ہیں۔ بعض ذرائع یہ تعداد ۸۰۰ تک بتا رہے ہیں۔ گزشتہ برس انہی دنوں میں جارک مکلسن نے کہا تھا کہ ادارہ ۱۱ فیصد تک افرادی قوت کو فارغ کرنا چاہتا ہے۔

معیشتوں کی بحالی کی راہ میں حائل دشواریوں اور بڑھتے ہوئے انتظامی اخراجات کے باعث علی بابا گروپ کے منافع میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ ماہِ رواں کے اوائل میں لزاڈا میں بھی چھانٹی ہوئی تھی۔ اس کا مقصد ادارے کی افرادی قوت کو ۳۰ فیصد کی سطح تک لانا تھا۔

پاکستان میں دراز کو ۲۰۱۹ء تک فروغ ملتا رہا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ نقصان بھی بڑھا ہے۔ اب کمپنی کے پاس اپنی مارکیٹ ویلیو اور مالیاتی استحکام برقرار رکھنے کے لیے چھانٹی کے سوا چارہ نہیں۔ انتظامیہ میں اعلیٰ سطح کے بڑی تنخواہوں والے افراد بھی فارغ کیے جا سکتے ہیں۔

دراز کو پاکستان میں مائیکرو اکنامک سطح پر چیلنجز کا سامنا ہے۔ دراز کے منافع میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ ای کامرس کا حجم گھٹ رہا ہے کیونکہ معیشت کو لاحق مشکلات برقرار ہیں۔ انتخاب کے موسم میں بھی حجم گھٹتا ہے اور رمضان المبارک کی بھی آمد آمد ہے جس کے دوران کام ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

فیشن آئٹمز اور الیکٹرانک مصنوعات کی ڈلیوری پر مامور عمومی ای کامرس کمپنیوں (ہیلیگیری اور پرائس اوئے وغیرہ) کی آمد سے بھی دراز کی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے۔ ان دونوں کمپنیوں کی آمدن بالترتیب ۴۵ اور ۷۹ لاکھ ڈالر رہی ہے۔

جن معاملات سے دراز کے لیے مشکلات پیدا ہوئیں انہی سے دوسری ای کامرس کمپنیوں کے لیے بھی مشکلات بڑھیں گی۔ لاگت گھٹانے اور کام کے بوجھ کو ڈھنگ سے برداشت کرنے کی خاطر دراز نے ۲۰۲۱ء کے آخر تک اپنی ۵۰ فیصد ڈلیوریز کو آؤٹ سورس کر دیا تھا۔ دراز میں چھانٹیاں ہوں گی تو ٹی سی ایس اور دیگر تھرڈ پارٹی لاجسٹک کمپنیوں میں بھی چھانٹیاں ہوں گی۔

آن لائن کاروبار کے خواہش مند افراد اور اداروں کو اب بہت سوچ سمجھ کر اس طرف آنا ہوگا۔ مسابقت بڑھنے سے منافع کمانے کی صلاحیت اور گنجائش گھٹتی جا رہی ہے۔ ایسے میں معیار پر سمجھوتا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں صارفین کا اعتماد مجروح ہوتا ہے۔

۲۰۲۳ء انسانیت کے لیے ایک اچھا سال؟

Nicholas Kristof

جب ایک نیا سال شروع ہوگیا ہے تو ''غزہ'' میں انسان موت کے منہ میں جارہے ہیں اور شاید ''دارفور'' میں نسل کشی کا سلسلہ پھر سے شروع ہوجائے۔ ایک شخص جس پر اکانوے قسم کے الزامات کی فردِ جرم عائد ہے، امریکا کے اگلے صدارتی الیکشن میں سبقت لے رہا ہے۔ اور ہمارے کرۂ ارض کو کاربن کے اخراج سے حدت کا سنگین خطرہ درپیش ہے۔ لیکن ایک اور بات بھی سچ ہے! کئی لحاظ سے ۲۰۲۳ء انسانی تاریخ کا ایک بہترین سال کہا جاسکتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ کسی انسان پر بدترین قسم کی کوئی آفت آسکتی ہے تو وہ یہ کہ وہ اپنے بچے سے محروم ہوجائے۔ تاریخی طور پر دیکھا جائے تو دنیا میں پیدا ہونے والے بچوں میں سے نصف پندرہ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے انتقال کر جاتے تھے۔ اس شرح میں انیسویں صدی سے مسلسل کمی آرہی ہے۔ اقوام متحدہ کے پاپولیشن ڈویژن کے اندازے کے مطابق ۲۰۲۳ء میں بچوں کی سب سے کم اموات ہوئی ہیں یعنی پانچ سال کی عمر کے بچوں کی شرحِ اموات محض ۳٫۶ فیصد رہی۔ یہ انسانی تاریخ کی کم ترین شرحِ اموات ہے۔ پھر بھی اس کا مطلب ہے کہ ۴۹ لاکھ بچے موت کے منہ میں چلے گئے لیکن یہ تعداد ۲۰۱۶ء میں مرنے والے بچوں کی تعداد سے دس لاکھ کم ہے۔ شدید غربت کا معاملہ ہی دیکھ لیں۔ اس میں ایک ریکارڈ کمی آئی ہے۔ اقوام متحدہ کی پروجیکشن کے مطابق دنیا بھر میں صرف ۸ فیصد آبادی غربت سے متاثر ہوئی ہے۔

یہ تمام اعداد و شمار محض تخمینوں پر مبنی ہیں لیکن لگتا ہے کہ ایک لاکھ افراد روزانہ خطِ غربت سے اوپر اٹھ رہے ہیں اور اس طرح انہیں صاف پانی تک رسائی، اپنے بچوں کو بہتر خوراک اور تعلیم دینے اور بیماری میں ادویات خریدنے کے مواقع مل رہے ہیں۔ ان تمام باتوں سے ان لوگوں کے دکھ درد میں کوئی کمی نہیں آرہی جو ۲۰۲۳ء میں اپنے بچوں سے محروم ہوگئے ہیں، نہ ان لوگوں کے درد کا کوئی درمان ہورہا ہے جو کسی جنگ یا ماحولیاتی تباہی کا شکار ہورہے ہیں۔ تاہم اس سال کے اختتام پر انسانی ترقی کے اس پس منظر کا اعتراف کرنا بنتا ہے نہ کہ اس کا مقصد آج بھی ہونے والے غلط کاموں سے کسی کی نظر ہٹانا ہے۔ میں صرف اس امر کی یاددہانی کرانا چاہتا ہوں کہ ہم جب کبھی سخت محنت کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی حیران کن کارنامہ سرانجام دیتے ہیں۔ لیکن اگر آج بھی دنیا بھر میں پائی جانے والی مشکلات اور آفات پر نظر دوڑائیں تو میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ہم بہت زیادہ محنت سے کام نہیں کررہے۔

میں ہر سال کے اختتام پر انہی دنوں میں ایک ایسا ہی آرٹیکل لکھتا ہوں جو میرے بہت سے قارئین کے لیے پریشانی کا باعث بنتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب اتنی بڑی تعداد میں انسان غیر ضروری طور پر جنگوں اور بیماریوں سے مررہے ہوں، جب انسانوں کی اکثریت کا مستقبل تاریک نظر آرہا ہو تو ایسے میں ترقی کے قصیدے پڑھنے کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں ان کا نقطۂ نظر بھی درست ہے۔ میں نے اپنا پورا صحافتی کیریئر نسل کشی، جنگوں اور غربت کی کوریج کرنے کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ لیکن عرصہ پہلے صحافی کے طور پر میں نے ایک بات سیکھی تھی کہ جب ہماری کوریج انتہائی منفی نوعیت کی ہو تو لوگ اس کے عادی ہوجاتے ہیں اور ان مسائل میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن اگر ہم غزہ کی جنگ اور موسمیاتی تبدیلیوں تک کے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ بات سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے کہ ان حالات میں بھی ترقی ممکن ہے۔ جس طرح صحتِ عامہ سے متعلق سائنسی آلات انسانی فلاح اور بہتری میں مصروف ہیں تو اسے صحت کے میدان کی ایک حوصلہ افزا خبر ہی کہا جائے گا۔ دو انتہائی خوفناک بیماریاں یعنی گنی کیڑے کی بیماری اور پولیو دنیا سے ختم ہونے کے قریب ہیں۔ ۲۰۲۳ء میں پورا سال، دنیا بھر سے پولیو کے صرف تیرہ کیسز رپورٹ ہوئے ہیں (ان میں ایسے کیسز بھی شامل ہیں جو پولیو ویکسین لگنے کی وجہ سے سامنے آئے جو ایک ثانوی مسئلہ ہے)۔ ۲۰۲۳ء یقیناً آخری سال ثابت ہوگا جب پولیو کسی انسان سے دوسرے انسان کو منتقل ہو گا۔ (ہمیں اس بیماری کے خلاف روٹری انٹرنیشنل کے شاندار کام کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہیے)۔ دریں اثناء ۲۰۲۳ء کے پہلے نو مہینوں میں دنیا بھر سے گنی کیڑے کی بیماری کے محض گیارہ کیسز رپورٹ ہوئے ہیں۔ (اس ضمن میں سابق امریکی صدر جمی کارٹر کی شاندار کارکردگی کو خراجِ تحسین پیش کرنا لازم ہے)۔

اسی طرح امریکی حکومت نے سِکل سیل بیماری کے خاتمے کے لیے CRISPR کی جین ایڈیٹنگ تکنیک کی منظوری دے دی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ سرطان اور دیگر ایسی بیماریوں کے خاتمے کے لیے بھی یہی تکنیک استعمال کی جائے گی۔ ایک اور اہم سنگ میل بھی عبور کرلیا گیا ہے، وہ یہ کہ آر ایس سی اور ملیریا کے خاتمے کے لیے بھی نئی ویکسینز کی منظوری دے دی گئی ہے اور امید ہے کہ ان کی مدد سے بچوں کی زندگیاں بچائی جاسکیں گی۔ کئی ممالک میں بلائنڈنگ ٹریکوما یعنی اندھے پن کی بیماری بھی خاتمے کی راہ پر گامزن ہے۔ اس بیماری میں مبتلا مالی کی ایک عورت نے کبھی مجھے بتایا تھا کہ اس بیماری کی بدترین اذیت بینائی سے محرومی نہیں بلکہ وہ شدید درد ہے جو زچگی کے درد سے بھی زیادہ اذیتناک ہے اور وہ سالہا سال تک جاری رہا۔ میں اب یہ سن کر حیران اور خوش بھی ہوں کہ مالی اور دیگر سولہ ممالک سے اندھے پن کی اس بیماری کا مکمل خاتمہ ہوگیا ہے۔

جو لوگ ۲۰۲۳ء کو ایک افسوسناک سال کے طور پر دیکھتے ہیں بلاشبہ وہ بھی ایک حد تک حق بجانب ہیں۔ اس سال کے دوران مجھے مشرق وسطیٰ میں جتنی بھی رپورٹنگ کرنا پڑی، وہ میرے لیے شدید ڈپریشن کا باعث بنی۔ بنگلادیش اور مڈغاسکر جیسے غریب ممالک کے لیے موسمیاتی تبدیلیاں بھی ایک سنگین خطرہ بن چکی ہیں۔ اس لیے مایوسی کا احساس حوصلہ افزا نہیں، اذیتناک ہے۔ یہ ایک متضاد قسم کا احساس ہے کہ ایک طرف دنیا دکھوں اور آفات سے بھری ہوئی ہے اور دوسری طرف میری زندگی ہی میں دنیا بھر میں بچوں کی شرح اموات میں ایک انقلابی کمی دیکھنے میں آئی ہے۔ خطِ غربت میں ایک بڑی کمی اور شرحِ خواندگی میں اتنا اضافہ ہوگیا ہے کہ اس میدان میں کردار ادا کرنے والے بہت سے افراد کو ان کی محنت کا درست صلہ نہیں مل سکا۔ میں نے ان میدانوں میں انسانی ترقی کی ایک جھلک دکھانے کی جو کوشش کی، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ دنیا میں جو دیگر مصائب اور آفات ابھی تک موجود ہیں، ۲۰۲۴ء کو ان کے تدارک اور خاتمے کے لیے استعمال کیا جائے۔

"This was a terrible year, and also maybe the best one yet for humanity".

("The New York Times". Dec 30, 2023)

مصنوعی ذہانت

ابو صباحت

زیادہ سے زیادہ آسانیاں یقینی بنانے کی ہر کوشش اپنے ساتھ بہت سی مشکلات بھی لاتی ہے۔ یہ بالکل فطری معاملہ ہے کیونکہ یہ دنیا چند انسانوں کے ذہن سے نہیں چل رہی۔ ہر انسان کچھ نہ کچھ سوچتا اور طے کرتا ہے اور پھر اُس کی بنیاد پر اُس کا عمل سامنے آتا ہے۔ سبھی اپنے اپنے مفادات کے لیے کام کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں مفادات کا تصادم کوئی ایسی حقیقت نہیں جس پر بہت حیرت ہو۔ ہر دور کے انسان نے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ آسانیاں یقینی بنانے کی کوشش کی ہے اور اِس کے نتیجے میں اُس کے لیے چند ایک مشکلات بھی ہوئی ہیں۔ آج بھی انسان کو اِسی چیلنج کا سامنا ہے۔

ہر دور کے انسان نے زیادہ سے زیادہ خود کاری (automation) کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اِس کوشش کے نتیجے میں زندگی کا حُلیہ بھی یوں تبدیل ہوا ہے کہ دیکھے ہی بنتی ہے۔ آج بھی یہی معاملہ ہے۔

کچھ مدت سے مصنوعی ذہانت کا بہت غلغلہ ہے۔ مصنوعی ذہانت کے بارے میں طرح طرح کے خیالات کا اظہار کیا جارہا ہے۔ اِن میں خدشات کا تناسب زیادہ ہے۔ عام آدمی کو مصنوعی ذہانت کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں مگر دفاتر میں کام کرنے والے اور قدرے پیچیدہ صنعتی عمل سے جُڑے ہوئے لوگ بہت فکر مند ہیں۔ مصنوعی ذہانت کا دائرۂ کار و اختیار وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ ہر گزرتا ہوا دن ہماری زندگی میں مصنوعی ذہانت کا عمل دخل بڑھا رہا ہے۔

کیا واقعی مصنوعی ذہانت ایسا معاملہ ہے جس سے بہت زیادہ خوفزدہ ہوا جائے؟ کیا مصنوعی ذہانت زندگی کے ہر معاملے پر محیط ہوسکتی ہے؟ مصنوعی ذہانت سے مؤثر طور پر نپٹنا ممکن ہے یا ہمیں اِس کے آگے ہتھیار ڈال دینے چاہئیں؟ ان تمام سوالوں کے جواب نفی یا اثبات میں نہیں دیے جاسکتے۔ ہر سوال کا جواب غور و فکر کا طالب ہے اس لیے بات ملے جلے انداز سے کہی جاسکتی ہے۔

مصنوعی ذہانت انسان کے لیے نعمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ نعمت اِس لیے کہ اس کی مدد سے زندگی آسان ہوئی جاتی ہے۔ کسی بھی انسان کی زندگی کا معاشی پہلو اولین ترجیح کا حامل ہوتا ہے کیونکہ معاشی معاملات پر متوجہ رہنے کی صورت ہی میں وہ اچھا کما سکتا ہے، زیادہ خرچ کرسکتا ہے اور یوں زندگی کے ڈھانچے کو اچھی حالت میں رکھ سکتا ہے۔ یہ تو ہوا مصنوعی ذہانت کا نعمت ہونا۔ اور زحمت؟ سیدھی سی بات ہے، جب بھی کسی معاملے کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو وہ ہمارے لیے زحمت بنتا ہے۔ مصنوعی ذہانت نے چند چیلنج بھی کھڑے کیے ہیں۔ مصنوعی ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے دنیا بھر میں آجر اپنے منافع کی شرح اور تناسب بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُن کی کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادہ کاموں میں انسانوں کی ضرورت نہ پڑے۔ مصنوعی ذہانت کو زیادہ بروئے کار لانے کی صورت میں آجروں کے لیے منافع بڑھانا ممکن ہوگیا ہے اور دوسری طرف اجیروں کی زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔ بے روزگاری کی تلوار ہر وقت سر پر لٹکتی رہتی ہے۔ کسی کو بھی یقین نہیں کہ اُس کی ملازمت اب کب تک ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ہم نے مصنوعی ذہانت سے بخوبی نپٹنے کی تیاری نہیں کی اور تیاری اس لیے نہیں کی کہ اس کے بارے میں زیادہ سوچا ہی نہیں یا اُس طرح نہیں سوچا جس طرح سوچنا چاہیے تھا۔ جب بھی کسی نعمت کے پیدا کردہ چیلنج کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو وہ نعمت ہمارے لیے زحمت میں تبدیل ہونے لگتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب معاملات ہمارے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ مصنوعی ذہانت کے حوالے سے بھی یہی ہوا ہے۔

دنیا بھر میں مشینوں کی حکمرانی کا تصور تین چار عشروں پہلے عام ہوا تھا۔ ترقی یافتہ دنیا نے مشینوں کی مدد سے معیشت کے تمام شعبوں کو اپنی گرفت میں لینے کا عمل شروع کیا تو یہ بات ذہن نشین رکھی گئی تھی کہ مشینوں کی مدد سے کام کو آسان بنانے کی صورت میں چند ایک دشواریاں بھی پیدا ہوں گی۔ اور دشواریاں بعد میں پیدا ہوئیں۔ ترقی یافتہ دنیا کے پالیسی ساز کسی بھی شعبے میں ممکن بنائی جانے والی پیش رفت کے تاریک پہلوؤں کو بھی ذہن نشین رکھتے ہوئے پالیسیاں مرتب کرتے ہیں۔ سوچنے والوں کو اندازہ تھا کہ خود کاری کے محاذ پر جتنی بھی پیش رفت ممکن بنائی جارہی ہے، وہ آگے چل کر بہت بڑے بحران میں بھی تبدیل ہوگی اور اُس سے بخوبی نپٹنے کے بارے میں نہ سوچا گیا تو معاملات صرف خرابی کی طرف جائیں گے۔

ترقی یافتہ دنیا، بالخصوص مغرب، نے بہت پہلے یہ بات سمجھ لی تھی کہ مصنوعی ذہانت کے نتیجے میں جو خود کاری پیدا ہوگی، وہ زندگی کے معاشی پہلو سے جُڑے ہوئے ہر معاملے کو متاثر کرے گی۔ اس حوالے سے تیاری کے بغیر معاملات کو درست رکھنا کسی طور ممکن نہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ ترقی یافتہ دنیا کے پالیسی سازوں نے مصنوعی ذہانت اور خود کاری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کا سامنا کرنے کے لیے بھرپور تیاری کی اور اُسی کی بدولت اب شدید ناموافق ماحول میں بھی اپنے لیے پنپنے کی گنجائش پیدا کرنے میں کامیاب ہیں۔

مصنوعی ذہانت دورِ حاضر کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ یہ کوئی نیا چیلنج نہیں۔ کم و بیش پانچ عشروں کے دوران مختلف شعبوں کے ماہرین نے زیادہ سے زیادہ خود کاری یقینی بنانے کے لیے جو محنت کی، اُس کا نتیجہ اب فیصلہ کن انداز سے سامنے آچکا ہے۔ مصنوعی ذہانت کے ذریعے اب ایسی چیزیں بنائی جاچکی ہیں جو محض اشارا پاکر اپنے طور پر کام کرنے لگتی ہیں۔ اُنہیں بروئے کار لانا بہت آسان ہے، اس لیے اُن کی قدر بھی غیر معمولی ہے۔ ایسے میں ہاتھ سے کام کرنے کی روایت کمزور پڑتی جارہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ انسان مصنوعی ذہانت کا مقابلہ کیسے کرے اور بالخصوص پسماندہ دنیا کے لوگ اپنے آپ کو کس طور دوڑ میں شریک رکھیں۔ یہ کہنا سادہ لوحی ہوگی کہ پسماندہ دنیا کے سامنے زیادہ آپشن نہیں بچے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے ممالک کے پاس اب کوئی آپشن نہیں یعنی جو کچھ بھی کرنا اُن کے لیے ناگزیر ہے، وہ کرنا ہی ہے۔ کوئی اور راستہ نہیں بچا جس پر چل کر خود کو زندہ اور معاملات سے وابستہ رکھا جاسکے۔ پسماندہ ممالک کو صدیوں کا فاصلہ چند برس میں طے کرنا ہے۔ اِس کے لیے اُنہیں بہت زیادہ محنت کرنا ہوگی۔ اور محض محنت سے بھی کچھ نہ ہوگا۔ ذہانت بھی درکار ہے اور وہ بھی درجۂ اول کی۔

کیا انفرادی سطح پر بہت سی تیاری کرنا کافی ہے؟ مصنوعی ذہانت سے مؤثر طور پر نپٹنے اور اُسے ڈھنگ سے بروئے کار لانے کے لیے کوئی بھی شخص اپنے طور پر جو کچھ کرسکتا ہے، وہ زندگی کا معیار بلند رکھنے اور معاشی امور میں خود کو ''متعلق'' رکھنے میں ایک خاص حد تک ہی کارگر ثابت ہوسکتا ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ حکومتیں اس حوالے سے کیا کر رہی ہیں اور جو کچھ کر رہی ہیں، وہ کچھ مطابقت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔

باقی صفحہ نمبر ۱۶

کیا خلا سے زمین پر بجلی منتقل کی جاسکتی ہے؟

Amanda Jane Hughes
& Stefania Soldini

یہ ایک سائنسی افسانے کی طرح لگتا ہے کہ ایک بہت بڑا شمسی توانائی کا اسٹیشن خلا میں تیرتے ہوئے زمین کو بہت زیادہ مقدار میں توانائی مہیا کرے۔ بہت عرصہ قبل اس تصور کو سب سے پہلے روسی سائنسدان کونسٹانٹن ٹیسوئیکوسکی (Konstantin Tsiolkovsky) نے ۱۹۲۰ء میں پیش کیا تھا۔

تاہم اب ایک صدی بعد سائنسدان اس تصور کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے بہت کوشش کر رہے ہیں۔ یورپین اسپیس ایجنسی کو اب اس کی افادیت کا احساس ہوا ہے اور اب وہ اس نوعیت کے منصوبے کو فنڈ کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ سائنسدانوں کی پیش گوئی ہے کہ اس منصوبے سے خلا سے جو پہلی صنعتی سطح پر توانائی حاصل ہوگی وہ ایک 'طاقتور توانائی کی شعاع' کی صورت میں ہوگی۔

اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ موسمیاتی تبدیلی ہے۔ لہٰذا بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ دنیا بھر میں بڑھتے درجۂ حرارت سے لے کر موسموں میں تبدیلی پہلے ہی محسوس کی جا رہی ہے۔ اس مسئلے پر قابو پانے کے لیے ہمیں توانائی پیدا کرنے اور اس کو استعمال کرنے کے طریقۂ کار کو سختی سے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ حالیہ برسوں میں قابل تجدید توانائی کی ٹیکنالوجی نے بہتر کارکردگی اور کم لاگت کے ساتھ حیران کُن ترقی کی ہے۔ لیکن ان کے استعمال میں ایک رکاوٹ یہ ہے کہ وہ مستقل توانائی کی فراہمی نہیں کرتے ہیں۔ ہوا یا شمسی توانائی سے پیدا ہونے والی بجلی کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ تب حاصل ہوتی ہیں جب ہوا چل رہی ہو یا سورج چمک رہا ہو لیکن ہمیں روزانہ چوبیس گھنٹے بجلی کی ضرورت ہے۔

بالآخر ہمیں قابلِ تجدید توانائی کے ذرائع کو تبدیل کرنے سے پہلے بڑے پیمانے پر توانائی ذخیرہ کرنے کے ایک طریقۂ کار کی ضرورت ہے۔

خلا کے فوائد

اس کا ایک ممکنہ حل یہ ہے کہ ہم خلا میں شمسی توانائی پیدا کریں۔ اس کے بہت سے فائدے ہیں۔ خلا میں قائم ایک شمسی توانائی پیدا کرنے کا اسٹیشن چوبیس گھنٹے سورج سے توانائی حاصل کرسکتا ہے۔ زمین کا کرہ ہوائی بھی سورج کی روشنی جذب اور خارج کرتا ہے، اس طرح زمین کے کرہ ہوائی کے اوپر موجود شمسی اسٹیشن کو سورج کی روشنی زیادہ میسر ہوگی اور وہ زیادہ توانائی پیدا کرے گا۔

لیکن اس میں سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ خلا میں اتنے بڑے ڈھانچوں کو کیسے بھیجا، جوڑا اور تعینات کیا جائے۔ ایک شمسی توانائی کے پینل کا حجم ۱۰ مربع کلومیٹر تک ہوسکتا ہے جو ۱۴۰۰ فٹبال گراؤنڈز کے برابر بنتا ہے۔

خلا میں ہلکے وزن کا ڈھانچا استعمال کرنا بھی مشکل ہے کیونکہ اس سب میں سب سے زیادہ خرچہ اس اسٹیشن کو خلا میں راکٹ کے ذریعے بھیجنے پر آئے گا۔ اس سلسلے میں ایک مجوزہ حل یہ دیا گیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے سیٹلائیٹس کا ایک جھنڈ تیار کیا جائے جنہیں خلا میں ایک ساتھ یکجا کر کے ایک بڑا شمسی اسٹیشن یا توانائی پیدا کرنے والے جنریٹر کی شکل دے دی جائے۔

۲۰۱۷ء میں کیلیفورنیا انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے محققین نے ماڈیولر پاور اسٹیشن کے لیے ڈیزائن کا خاکہ پیش کیا، جس میں ہزاروں انتہائی ہلکے شمسی سیل ٹائل شامل تھے۔ انہوں نے ۲۸۰ گرام وزنی پروٹوٹائپ ٹائل کی بھی نمائش کی تھی جو صرف ایک مربع میٹر حجم کی تھی۔

حال ہی میں مینوفیکچرنگ شعبے میں ہونے والی تھری ڈی پرنٹنگ جیسی پیشرفت کی بھی خلا میں استعمال اور افادیت کے بارے میں تحقیقات کی جا رہی ہے۔ یونیورسٹی آف لیورپول میں ہم وزن ہلکے شمسی پینل کی تیاری کے نئے طریقوں کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ شمسی پلیٹیں تہہ ہو جانے والی، وزن میں ہلکی اور بہت زیادہ روشنی منعکس کرنے کے ساتھ ساتھ سورج کی تابکاری کے دباؤ کو برداشت کرتے ہوئے خلائی جہاز کو بنا تیل کے چلنے میں مدد دے سکیں۔ ہم شمسی سیلز کو ان پلیٹوں پر لگانے کے طریقوں کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ بڑے اور بنا تیل کے توانائی پیدا کرنے والے اسٹیشن قائم کیے جاسکیں۔ یہ طریقۂ کار ہمیں خلا میں بجلی یا توانائی پیدا کرنے والے اسٹیشن بنانے میں مدد دیں گے۔

درحقیقت یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک دن بین الاقوامی خلائی اسٹیشن یا مستقبل کے قمری گیٹ وے اسٹیشن سے خلا میں یونٹس کی تیاری اور ان کی تعیناتی ممکن ہو سکے جو چاند کے گرد گردش کرے۔ اس طریقے کے آلات ہمیں چاند پر بجلی مہیا کرنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔

ممکنات کا سفر یہاں ختم نہیں ہوتا، اگرچہ ہم اس وقت پاور اسٹیشنوں کی تعمیر کے لیے زمین سے آنے والے میٹریل یا مواد پر انحصار کر رہے ہیں، سائنس دان مینوفیکچرنگ کے لیے خلا سے وسائل استعمال کرنے پر بھی غور کر رہے ہیں، جیسے چاند پر پائے جانے والے مواد۔

لیکن آنے والے وقت میں سب سے بڑے چیلنجوں میں سے ایک بجلی کو زمین پر منتقل کرنا ہوگا۔ اس بارے میں منصوبہ یہ ہے کہ شمسی سیلز سے بجلی کو توانائی کی لہروں میں تبدیل کیا جائے اور ان کو الیکٹرومیگنیٹک فیلڈز کو استعمال کرتے ہوئے زمین کی سطح پر اینٹینا کے ذریعے منتقل کیا جائے۔

یہ اینٹینا پھر لہروں کو بجلی میں تبدیل کر دے گا۔ جاپان ایرو اسپیس ایکسپلوریشن ایجنسی کی سربراہی میں محققین پہلے ہی ڈیزائن تیار کر چکے ہیں اور مدار کے نظام کا تجربہ کر چکے ہیں جو ایسا کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں ابھی بہت کام کرنا باقی ہے لیکن مقصد یہ ہے کہ آنے والے عشروں میں خلا میں سولر پاور اسٹیشن ایک حقیقت بن جائیں گے۔

چین میں سائنسدانوں نے ایک ایسا نظام تیار کیا ہے جس کا نام اومیگا ہے اور وہ اسے ۲۰۵۰ء تک قابلِ استعمال بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ نظام زمین میں دو گیگا واٹ بجلی منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوگا جو کہ بہت زیادہ بجلی ہے۔ اس مقدار میں زمین پر سولر پینلز کے ذریعے سے بجلی بنانے کے لیے آپ کو ۶۰ لاکھ سولر پینلز درکار ہوں گے۔ تاہم چھوٹے شمسی توانائی والے سیارے جو چاند گاڑیوں کو بجلی دینے کے لیے بنائے جاتے ہیں، اس سے بہت پہلے قابل استعمال ہو سکتے ہیں۔

دنیا بھر میں سائنسدان برادری اپنا وقت اور کاوشیں خلا میں بجلی گھر بنانے کی کوششوں میں صرف کر رہی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کے ایک دن یہ آلات موسمیاتی تبدیلیوں جیسے چیلنجوں کے خلاف لڑائی میں نہایت اہم ثابت ہوں گے۔

ایمانڈا جین ہیوگس یونیورسٹی آف لیورپول میں انرجی انجینئرنگ کی لیکچرار ہیں۔ وہ شمسی سیلز اور آپٹیکل آلات کے متعلق تحقیق کرتی ہیں۔ اسٹیفانیا سولڈنی یونیورسٹی آف لیورپول میں ایروسپیس کی لیکچرار ہیں۔

"Solar power stations in space could be the answer to our energy needs".
("theconversation.com". November 19, 2020)

صلاحیت کے حصول میں کون آگے؟

Greta Ruffino

کورونا وائرس کی وبا کے ہاتھوں پہنچنے والے نقصان کے ازالے کے لیے اب دنیا بھر میں معیشتیں بحالی کی طرف رواں ہیں۔ امریکا اور یورپ سمیت تمام ترقی یافتہ ممالک اور خطوں میں ایک دوڑ سی لگی ہے۔ یہ دوڑ ہے زیادہ سے زیادہ باصلاحیت، تربیت یافتہ اور ہنرمند نوجوانوں کی خدمات کے حصول کی۔ سوئٹزرلینڈ، امریکا، سنگاپور، کینیڈا اور دوسرے بہت سے ترقی یافتہ اور متمول ممالک چاہتے ہیں کہ امیگریشن کا دائرہ وسیع کریں۔ بہتر تعلیم و تربیت کے حامل نوجوانوں کی خدمات کا حصول یقینی بنانے کے لیے حکومتیں نئی پالیسیاں مرتب کر رہی ہیں۔ غیر قانونی تارکینِ وطن کی آمد روکنے کے لیے قانونی طریقے سے افرادی قوت درآمد کرنے کی پالیسیاں اپنائی جارہی ہیں۔

دی گلوبل ٹیلنٹ کمپی ٹیٹونیس انڈیکس (جی ٹی سی آئی) کے ذریعے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون سا ملک باصلاحیت افراد کو اپنے ہاں زیادہ آسانی سے بلاسکتا ہے۔ اسی بات کو یوں بھی پرکھا جاسکتا ہے کہ کون سے ممالک کو ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کے باصلاحیت نوجوان طبع آزمائی کے لیے ترجیح دیتے ہیں۔ یہ انڈیکس ہر سال درجہ بندی کرکے بتاتا ہے کہ پسماندہ ممالک کے باصلاحیت، ہنرمند اور پُرجوش نوجوان ترجیحاً کن ممالک میں جاکر مقدر آزمارہے ہیں۔

GTCI نے ۲۰۲۳ء کی درجہ بندی میں سوئٹزرلینڈ، سنگاپور اور امریکا کو نمایاں پوزیشن کا حامل قرار دیا ہے۔ ٹاپ ۱۰ میں ڈنمارک، دی نیدرلینڈز (ہالینڈ)، فن لینڈ، ناروے، آسٹریلیا، سوئیڈن اور برطانیہ بھی شامل ہیں۔ ٹاپ ۲۵ میں یورپ کے ۱۷ ممالک شامل ہیں۔ ایک عشرے کے دوران اس انڈیکس میں برطانیہ، لگزمبرگ اور آئس لینڈ نیچے گئے ہیں جبکہ ناروے اور آسٹریلیا کی پوزیشن بہتر ہوئی ہے۔ جی ٹی سی آئی دراصل ایک رپورٹ پر مبنی ہوتا ہے جو ہر سال فرانس کا نان پرافٹ گریجویٹ بزنس اسکول INSEAD جاری کرتا ہے۔ اس کام میں اُسے جنیوا کی کنسلٹنسی فرم ڈیکارٹ انسٹیٹیوٹ فار فیوچر اور ہیومن کیپٹل لیڈرشپ انسٹیٹیوٹ کی معاونت حاصل ہے۔

GTCI میں ۱۳۴ ممالک کا موازنہ پیش کیا جاتا ہے۔ ایک عشرے کے دوران ٹاپ پوزیشنز میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ ہیومن کیپٹل لیڈرشپ انسٹیٹیوٹ کی چیف ایگزیکٹیو آفیسر ڈورس سوہمن پاؤنے باصلاحیت افراد کی خدمات حاصل کرنے کے عمل سے جُڑی ہوئی پیچیدگیوں کو نمایاں کرکے بیان کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں ''دنیا بھر کے باصلاحیت افراد بالخصوص نوجوانوں کی خدمات حاصل کرنے والے ممالک کی رینکنگ میں پہلی ۱۰ پوزیشنز میں اگرچہ کچھ خاص تبدیلیاں رونما نہیں ہوئی ہیں تاہم دنیا بھر کی صنعتوں میں ٹیلنٹ مینجمنٹ کے حوالے سے تیز رفتار تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں، وباؤں اور میدان میں ڈٹے رہنے کی ضرورت نے دنیا بھر کے صنعتی، تجارتی، مالیاتی اور تکنیکی اداروں کو اندرونی تبدیلیوں پر بھی مجبور کیا ہے''۔

''دنیا بھر میں بعض معیشتوں نے تیزی سے پنپ کر مختلف خطوں کے باصلاحیت نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس معاملے میں چین اور روس نمایاں ہیں۔ خلیج فارس کے ممالک اور چند دوسرے خطوں میں بھی افرادی قوت کی ضرورت ہے تاہم وہاں زیادہ کمانے کے مواقع نہیں۔ جی ٹی سی آئی میں چین کا نمبر ۴۰ اور روس کا ۵۲ ہے''۔

''ایک اہم سوال یہ ہے کہ بعض ممالک دنیا بھر کے باصلاحیت نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں دوسروں سے زیادہ کامیاب کیوں ہیں۔ بیرونِ ملک جاکر مقدر آزمانے والے سب سے زیادہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ زیادہ کمانے کا موقع ملے۔ جن ممالک میں زیادہ کمائی کی گنجائش ہو، وہاں جانا نئی نسل کو زیادہ پسند ہے۔ جن معیشتوں میں پنپنے کی زیادہ گنجائش ہوتی ہے، وہ افرادی قوت کی درآمد کے حوالے سے غیر معمولی ترجیح کا درجہ پاتی ہیں''۔

سوئٹزرلینڈ ایک عشرے سے پہلے نمبر پر ہے۔ اس کا بنیادی سبب صرف یہ نہیں کہ وہاں تنخواہیں بہت اچھی ہیں بلکہ سیاسی استحکام اور سلامتی کی صورتحال بھی بڑا عنصر ہے۔ سوئٹزرلینڈ مجموعی طور پر انتہائی پُرامن ملک ہے۔ لوگ سیاست میں زیادہ نہیں پڑتے اور مجموعی بہبود کو یقینی بنانے پر ترجیح دیتے ہیں۔ قوانین سخت اور انسان دوست ہیں۔ کاروباری ادارے ملازمین کے حقوق کے حوالے سے ڈنڈی نہیں مارسکتے۔

سوئٹزرلینڈ پہلے نمبر پر اس لیے بھی ہے کہ ایک طرف تو وہاں سماجی تحفظ غیر معمولی ہے اور دوسری طرف فطری ماحول کو محفوظ رکھنے کا بھی خاطر خواہ اہتمام کیا جاتا ہے۔

سنگاپور میں نسلی تنوع غیر معمولی ہے۔ وہاں رسمی تعلیم بھی اعلیٰ درجے کی ہے۔ تعلیم و تربیت کے مرحلے سے کامیاب گزرنے والوں کو ملازمت کے بہترین مواقع میسر ہیں۔ وہاں بین الاقوامی کاروباری اداروں کو کھلے دل سے قبول کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے باصلاحیت نوجوانوں کا وہاں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

۲۰۲۲ء میں امریکا اپنی تیسری پوزیشن سے محروم ہوچکا تھا۔ ۲۰۲۳ء میں وہ دوبارہ تیسرے نمبر پر آگیا۔ یہ مقام اُسے اپنی عالمی معیار کی جامعات کی بدولت ملا ہے اور اس لیے بھی کہ امریکا میں اگر کوئی زندگی بھر پڑھنا اور سیکھنا چاہے تو ایسا کرنا بہت آسان ہے۔ یوں زندگی کا معیار بلند کرنا زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ امریکا میں مینوفیکچرنگ کا شعبہ مضبوط ہے جس کے نتیجے میں وہاں باصلاحیت نوجوانوں کو کھپاتے رہنے کی گنجائش پیدا ہوتی رہتی ہے۔

ایک عشرے کے دوران کئی ممالک نے اپنے ہاں باصلاحیت افراد کی کھپت کی گنجائش پیدا کرکے جی ٹی سی آئی میں اپنی رینکنگ بہتر بنائی ہے۔ البانیا، انڈونیشیا اور آذربائیجان کی پوزیشن اب بالترتیب ۱۶، ۱۴ اور ۱۳ ہے۔

دنیا بھر میں باصلاحیت اور تربیت یافتہ افرادی قوت کی طلب تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں بے روزگاری کا گراف بلند رہتا ہے۔ ایسے میں ایک اچھا آپشن یہ ہے کہ کسی طور ترقی یافتہ ممالک کا رخ کیا جائے اور وہاں اپنی صلاحیتوں کو ڈھنگ سے بروئے کار لاکر بہتر زندگی کے امکانات تلاش کیے جائیں۔ جی ٹی سی آئی رپورٹ کہتی ہے کہ اگلے عشرے کے دوران دنیا بھر میں باصلاحیت نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا رجحان تیزی سے پروان چڑھے گا اور اس حوالے سے مسابقت بھی شدت اختیار کرے گی۔

تجارت، سرمایہ کاری، سیاست اور سفارت کے شعبوں میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کے نتیجے میں دنیا بھر میں غیر یقینی صورتحال بھی پیدا ہوگی تاہم اس کے باوجود باصلاحیت اور تربیت یافتہ افرادی قوت کے حصول کی جنگ میں بھی نئے محاذ کھلیں گے۔ جن ترقی یافتہ ممالک میں شرحِ پیدائش پریشان کن حد تک کم ہے، وہ معیاری افرادی قوت کے حصول کے لیے غیر معمولی کاوش کریں گے۔

معاشی سرگرمیوں کے میدان میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں گی۔ معیشت کے نئے ماڈل ابھرتے رہیں گے۔ مصنوعی ذہانت اور دیگر ٹیکنالوجی کے ابھرنے سے بہت کچھ نیا سامنے آتا رہے گا۔ اس کے نتیجے میں افرادی قوت کا تنوع بھی درکار ہوگا۔ کام کے ماحول میں پیچیدگی پیدا ہونے کی صورت میں باصلاحیت افراد کی ضرورت پہلے سے کہیں بڑھے گی۔

باقی صفحہ نمبر ۱۵

چین: آبادی میں کمی کا سنگین مسئلہ

Alexandra Stevenson & Zixu Wang

چینی کمیونسٹ پارٹی کو ایک قومی ایمرجنسی کا سامنا ہے جس کا حل یہ ہے کہ چینی خواتین زیادہ بچے پیدا کریں۔ اس مقصد کے لیے انہیں سستے گھر، ٹیکس میں چھوٹ اور نقد رقم کا لالچ دیا جا رہا ہے۔ حب الوطنی کے نام پر انہیں اچھی بیویاں اور مائیں بننے کی اپیل کی جا رہی ہے لیکن کوئی کامیابی نہیں مل رہی۔ خواتین شادی اور بچے پیدا کرنے سے گریز کر رہی ہیں چنانچہ ۲۰۲۳ء میں بھی چین کی آبادی میں کمی ہوئی ہے۔ عمر رسیدہ آبادی میں اضافے اور معاشی ناکامی سے حکومت میں تشویش بڑھ رہی ہے۔ ۲۰۲۳ء میں بانوے لاکھ بچے پیدا ہوئے جبکہ ۲۰۲۲ء میں ۹۵ لاکھ ۶۰ ہزار بچے پیدا ہوئے تھے جبکہ اس سال ایک کروڑ دس لاکھ افراد فوت ہوئے ہیں۔ دنیا میں عمر رسیدہ افراد کی سب سے زیادہ تعداد چین میں ہے۔ ۲۰۲۳ء میں اس کی آبادی ۲۰ لاکھ کم ہوگئی ہے۔ چین کو اپنی معیشت چلانے کے لیے افرادی قوت میں کمی کا سامنا ہے جبکہ ناقص ہیلتھ کیئر اور پنشن سسٹم کو مالیاتی دباؤ کا بھی سامنا ہے۔

چین کو ایک بچہ پالیسی کی وجہ سے یہ مسئلہ درپیش ہے؛ چنانچہ چین میں خواتین کی آبادی بڑھ گئی ہے اور ملازمتوں میں بھی ان کا حصہ بڑھ گیا ہے۔ خواتین سمجھتی ہیں کہ حکومت بچے پیدا کرنے کے لیے اب انہیں دوبارہ گھروں میں دھکیلنا چاہتی ہے۔ صدر شی جن پنگ پہلے ہی چینی خواتین کو اپنا روایتی کردار ادا کرنے کے لیے کہتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے سرکاری حکام پر شادی اور بچوں کی پیدائش کا کلچر پروموٹ کرنے پر زور دیا ہے۔ لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ تمام کوششیں چینی خواتین کے شادی اور والدین بننے کے حوالے سے نظریات تبدیل کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ صنفی عدم توازن کے خاتمے کے قوانین بھی نتائج دینے میں ناکام رہے ہیں۔

سوشل میڈیا پر وفیشنل راشیل چن کا کہنا ہے کہ خواتین آج بھی چین میں بچوں کی پیدائش کے ضمن میں بے یقینی کا شکار ہیں۔ ۳۳ سالہ راشیل کی شادی کو پانچ سال ہوگئے ہیں اور وہ کوئی بچہ نہیں پیدا کرنا چاہتی۔ اس کا کہنا ہے کہ حکومت بچے تو چاہتی ہے مگر انہیں جنم دینے والی ماؤں کے حقوق اور مفادات کے تحفظ میں کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔ ریاستی پروپیگنڈا اور باہم میل جول کے مواقع فراہم کرنے کا مقصد نوجوانوں کو شادی اور بچے پیدا کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ چین میں غیر شادہ شدہ جوڑوں میں بچے پیدا کرنے کا رجحان نہیں ہے۔ حکومت نوجوانوں پر زور دے رہی ہے کہ وہ قوم کو نوجوان خون دینے میں اپنا کردار ادا کریں۔ والدین کو یہ پیغام تو مل گیا ہے مگر ان کی اکثریت شادی کے حوالے سے پہلے ہی روایتی نقطۂ نظر رکھتی ہے۔ راشیل چن کے والدین اس کے بچے پیدا نہ کرنے کے فیصلے کی وجہ سے کافی پریشان ہیں اور اکثر فون پر رونا شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''اب ہمیں اپنے والدین مت سمجھنا''۔

جنسی ہراسانی اور جائے ملازمت پر امتیازی سلوک کی وجہ سے چینی خواتین میں اپنے حقوق کے حوالے سے بہت آگہی پائی جاتی ہے۔ اتھارٹیز نے حقوقِ نسواں تحریک کو خاموش کرانے کی بہت کوشش کی ہے لیکن ان کا مساوی حقوق اور سلوک کا نظریہ بہت مقبول ہے۔ چین میں نسوانی حقوق کی ایک علمبردار ژینگ چوران کہتی ہیں کہ ''گزشتہ دس برسوں کے دوران انٹرنیٹ نے ایک نسوانی کمیونٹی کو پروان چڑھایا ہے۔ آج کی خواتین پہلے سے زیادہ بااختیار ہو چکی ہیں۔ کچھ عرصے سے نسوانی حقوق سے متعلق مکالمے کی حوصلہ شکنی کی جا رہی ہے؛ تاہم خواتین آن لائن اپنے تجربات شیئر کرتی ہیں اور متاثرہ خواتین کو سپورٹ کرتی ہیں''۔

کتابوں کی حد تک صنفی مساوات سے متعلق قوانین کو پرموٹ کیا جاتا ہے۔ نسوانی حقوق کی ایک اور متحرک کارکن گاؤ ژنگ کہتی ہیں کہ روزگار کی فراہمی میں صنف، نسل کی بنیاد پر امتیاز برتنا غیر قانونی ہے۔ مگر عملی طور پر کمپنیاں ملازمت کے لیے صرف مرد امیدواروں کا اشتہار دیتی ہیں اور خواتین ملازمین کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ کئی لحاظ سے خواتین زندگی کے ہر شعبے میں امتیازی سلوک کے حوالے سے زیادہ آگہی رکھتی ہیں۔ خواتین کے لیے تو عدالتوں تک سے انصاف حاصل کرنا مشکل ہے۔ حال ہی میں سوشل میڈیا پر ایسے مضامین اور پوسٹس شیئر ہوئی ہیں جنہوں نے قوم کی توجہ ٹینگ شن صوبے کے ایک ریستوران میں خواتین پر ہونے والے وحشیانہ تشدد کی طرف مبذول کرائی ہے۔ آٹھ بچوں کی ایک ماں کی کہانی بھی شیئر کی گئی ہے جسے زنجیروں میں جکڑ کر قید رکھا گیا تھا۔ جو خواتین شادی نہیں کرنا چاہتیں، وہ تشدد کی ایسی ہی کہانیوں کو جواز بنا کر پیش کرتی ہیں۔ قوانین اور پالیسیوں میں بھی کئی تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں، مثال کے طور پر کسی بھی سول طلاق کے فائنل ہونے سے پہلے تیس دن کی ایک مدت مقرر کی گئی ہے جس میں جوڑے کو ایک بار پھر ٹھنڈے دل سے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کا موقع دیا جائے گا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ نو برس میں شادیوں کے ناکام ہونے کی شرح میں بھی اضافہ دیکھا گیا ہے۔ پہلے یہ رجحان صرف شہروں تک ہی محدود تھا مگر اب یہ سلسلہ دیہی علاقوں تک پھیل گیا ہے۔

خواتین میں شادی نہ کرنے کے رجحان کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اگر شادی نہ چلے تو خواتین کے لیے عدالت سے طلاق حاصل کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ انڈیانا یونیورسٹی کے پروفیسر ایتھان مچلسن نے طلاق کے ڈیڑھ لاکھ واقعات کا تجزیہ کیا اور بتایا کہ خواتین کی طرف سے جتنے بھی مقدمات دائر کیے گئے تھے ان میں سے اسی فیصد درخواستوں کو پہلے مرحلے پر ہی جج نے مسترد کر دیا تھا حالانکہ گھریلو تشدد کے ٹھوس ثبوت موجود تھے۔ ستر فیصد کیسز کو دوسرے مرحلے میں مسترد کر دیا جاتا ہے۔ پروفیسر مچلسن کا مزید کہنا ہے کہ حکومت کی اعلیٰ ترین شخصیات، جن میں صدر شی جن پنگ بھی شامل ہیں، کی طرف سے مسلسل یہ سگنلز دیے جاتے ہیں کہ چین کی سوسائٹی میں خاندان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، جو سماجی استحکام اور قومی ترقی میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرکار کی طرف سے ملنے والے یہی سگنلز ججوں کے فیصلوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک آن لائن پوسٹ بہت مشہور ہوگئی ہے کہ ''شادی کا لائسنس ملنے سے تشدد کا لائسنس بھی مل جاتا ہے''۔ گزشتہ موسم گرما میں ایک ایسے ہی کیس میں شمال مغربی صوبے گینگ سو کی ایک عورت کی طلاق کی درخواست کو گھریلو تشدد کے ٹھوس ثبوت ہونے کے باوجود مسترد کر دیا گیا تھا۔ جج کا کہنا تھا کہ جوڑے کو اپنے بچوں کی خاطر اکٹھے رہنا چاہیے۔ سپریم پیپلز کورٹ نے بھی طلاق کیسز میں یہ فیصلہ دیا کہ طلاق کی صورت میں خاندان کا گھر اسے ملے گا جس کا نام ملکیتی دستاویز میں درج ہوگا، اس کا عمومی فائدہ بھی مردوں کو ملتا ہے۔

"China told women to have babies, but its population shrank again".
("The New York Times". Jan 18, 2024)

نظریاتی تاریخ کا اختتام

فرانسس فوکویاما

گزشتہ ایک دہائی کے دوران رونما ہونے والے واقعات کا جائزہ لیا جائے تو اس تاثر کی نفی مشکل معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کی تاریخ میں کوئی بہت بنیادی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ ہم نے سرد جنگ کے خاتمے کے حوالے سے مضامین کی بھرمار دیکھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ بہت مدت کے بعد پہلی بار عالمی امن کے لیے کوششوں میں اضافہ بھی نظر آیا۔ ان تمام مضامین میں ایک بات کا فقدان نظر آیا اور وہ یہ کہ مصنفین یہ بات سمجھانے سے قاصر رہے کہ دنیا کی تاریخ کے لیے کیا شئے ہے جو لازم ہے اور کیا محض حادثاتی۔

اس کے باوجود ان تمام لکھنے والوں اور تجزیہ کاروں کو شاید مبہم طور پر یہ احساس ضرور تھا کہ تبدیلی کی کوئی لہر واقعات کے پس پردہ ہے اور اخبارات کی شہ سرخیوں کے لیے خام مال کا کردار ادا کر رہی ہے۔ بیسویں صدی کے دوران ہی ہم نے ترقی یافتہ دنیا کو متشددانہ نظریاتی تصادم میں مبتلا دیکھا۔ پہلے پہل لبرل ازم کا مقابلہ استبدادی قوتوں کی باقیات سے، اس کے بعد اشتراکیت اور فسطائیت ایک ایک کر کے مقابل آئے اور اس کے بعد مارکس ازم اپنی جدید شکل میں اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ یہ تمام معاملات دنیا کو ایٹمی جنگ کی طرف لے گئے۔

یہ صدی، جس کا آغاز مغربی آزاد جمہوریت کی مکمل کامیابی کے اعتماد کے ساتھ ہوا تھا، اپنے اختتامی دور میں وہیں پہنچ گئی جہاں سے چلی تھی یعنی نظریاتی کشمکش کا خاتمہ یا سرمایہ داری اور سوشل ازم کا اختلاط نہیں بلکہ آزاد تجارت اور لبرل ازم پر مبنی جمہوری نظام کا قیام۔ مغربی تصوّرات اور خیالات کی فتح اس بات سے واضح ہے کہ اس کے پیش کردہ لبرل نظام کے مقابلے میں تمام منظّم و متبادل نظام فرسودگی کا شکار ہیں۔ گزشتہ دہائی کے دوران دنیا کی دو بڑے اشتراکی ممالک کی ذہنی و فکری اپج میں تبدیلی واضح ہے اور وہاں اصلاحی عمل کا بتدریج آغاز نہایت واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے تاہم تبدیلی کی وسعت صرف سیاسی میدان ہی میں نظر نہیں آتی بلکہ اس کے مظاہر میں چین اور روس میں تیزی سے جنم لینے والا ''صارف رجحان'' بھی شامل ہے۔ گزشتہ برس روس میں غیر ملکی ریستوران اور کپڑوں کے اسٹورز کا افتتاح، چین میں رنگین ٹی وی کی آمد اس کے علاوہ رنگون، تہران اور پراگ جیسے متنوع ممالک میں مغربی مصنوعات اور موسیقی کا نفوذ مغربی تہذیب کی رسائی کو ظاہر کرتا ہے اور یہ بھی کہ معاشی ترقی کے ثمرات نہ صرف وہاں بتدریج پہنچ رہے ہیں بلکہ مغربی لبرل ڈیموکریسی کے حوالے سے سیاسی شعور میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

جو کچھ ہم مشاہدہ کر رہے ہیں وہ محض سرد جنگ یا بعد از جنگ دور کا اختتام نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی انسانی نظریات کی تاریخ کا سفر بھی ختم ہو رہا ہے یعنی دوسری جنگ عظیم کے بعد شروع ہونے والا دور ہی ختم ہونے کو نہیں، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ انسان کا نظریاتی ارتقا بھی انجام پذیر ہے اور عالمگیر سطح پر اب مغربی لبرل ڈیموکریسی ہی ایک واحد سیاسی نظام کی حیثیت سے دنیا کا مقدر ٹھہری ہے کیونکہ اس سارے تاریخی عمل کے دوران یہی نظام متشکل ہو کر سامنے آیا ہے۔ نظریاتی تاریخ کے خاتمے سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ اب ''فارن افیئرز'' میگزین کو اپنے سالانہ ایڈیشن کے لیے بین الاقوامی سیاسات کے حوالے سے کوئی موضوع یا واقعہ نہیں مل پائے گا۔ لبرل ازم کی فتح، جس کا ابھی میں نے اوپر ذکر کیا ہے، محض نظریات کی دنیا میں ہوئی ہے، حقیقی دنیا میں نہیں مگر اس بات کے تیقن کے لیے ٹھوس دلائل موجود ہیں کہ طویل مدت کے دوران اب یہی خیال دنیائے سیاست پر حکمرانی کرے گا۔

''نظریاتی تاریخ کے خاتمے'' کا خیال کوئی نیا تصور نہیں۔ اس کا سب سے معروف مبلغ کارل مارکس تھا، جس کا خیال تھا کہ تاریخی تبدیلی کی سمت بامقصد ہوتی ہے اور جس کا تعین معاشرے میں برسرِ پیکار متضاد مادی قوتیں کرتی ہیں، اور یہ کشمکش مختلف طبقات کے مابین جاری رہتی ہے۔ مارکس کا کہنا تھا کہ عالمگیر اشتراکی حکومت کے قیام تک یہ کشاکش جاری رہے گی۔ اور یوں تمام تضادات کا بھی خاتمہ ہوگا۔ تاریخ کو ایک جدلیاتی عمل کے طور پر متعارف کرانا، یعنی اس کا آغاز، درمیانی دور اور پھر اپنے انجام سے دوچار ہونے کا تصور مارکس نے اپنے جرمن پیش رو ہیگل سے مستعار لیا تھا۔ کارل مارکس نے اپنے پیش کردہ خیال کی بنیاد دراصل ہیگل کے فلسفے پر رکھی تھی۔ اچھا یا برا، تاریخ سے متعلق ہیگل کا تصور ہمارے فکر و دانش کا حصہ بن چکا ہے۔ ہیگل وہ پہلا فلسفی تھا جو جدید سماجی علوم کی زبان سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک انسان ٹھوس تاریخی اور سماجی ماحول کی پیداوار ہے۔ اس کے برعکس یہ نظریہ کارفرما رہا ہے کہ انسان محض فطرت کے مخصوص خصائص کا حاصل ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کو بروئے کار لاتے ہوئے انسان کا فطرتی قوتوں پر بالادستی حاصل کرنے اور ان میں تبدیلی لانے کا تصور دراصل ہیگل ہی کا تھا، مارکس کا نہیں۔

یہ ہیگل کی بدقسمتی ہے کہ اسے عام طور پر محض مارکس کے پیش رو کے طور پر جانا جاتا ہے اور یہ ہماری ناشناسی ہے کہ ہم میں سے بہت کم لوگوں نے ہیگل کا مطالعہ براہ راست کیا ہے۔ فرانس میں ایسی کوشش ضرور کی گئی ہے کہ ہیگل کو مارکس ازم کی تشریحات سے بچایا جائے اور اسے ایک ایسے فلسفی کے طور پر پیش کیا جائے جو ہمارے دور کی ترجمانی کرتا ہے۔ ہیگل کے ان جدید شارحین میں الیگزنڈر کوجو (Kojo) بھی ہیں جو ہیگل کے فلسفے میں مکمل دسترس رکھتے ہیں۔

کوجو نے ہیگل کی تصنیف Phenomenology of Mind کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہیگل نے ۱۸۰۶ء میں تاریخ کے خاتمے کا اعلان کیا تھا کیونکہ نپولین کے ہاتھوں جرمنوں کی شکست، انقلاب فرانس کی کامیابی، آزادی اور مساوات کے اصولوں کی عالمگیر سطح پر قبولیت اور نفاذ نے اسے ایسا کہنے پر مائل کیا تھا۔ ۱۸۰۶ء کے بعد تو ہم نے مزید قابل ذکر واقعات دیکھے، جن میں غلامی اور غلاموں کی تجارت کا خاتمہ، مزدوروں، عورتوں، سیاہ فام افراد اور دیگر نسل پرست اقلیتوں کو ان کے حقوق دیئے گئے، جو کہ دراصل سب آزاد جمہوری ریاست کے بنیادی خواص ہیں۔ دو عالمی جنگیں اور ان سے وابستہ تحاریکِ آزادی دراصل انہی اصولوں کے فروغ کا نتیجہ تھیں کیونکہ یہ تمام مظاہر اپنے پھیلاؤ کا مطالبہ کرتے ہیں اور پھر انسانی تہذیب کو ایک ایسے مقام پر لے آئے جہاں یورپی اور شمالی امریکا میں موجود معاشروں کو ان جمہوری اصولوں کے نفاذ پر مجبور ہونا پڑا۔

ہیگل کے مطابق ایسے تمام تضادات جو تاریخ کا محرک ہوتے ہیں، ان سب کا وجود انسانی شعور سے وابستہ ہوتا ہے یعنی یہ تمام تصوّراتی سطح پر رونما ہوتے ہیں۔ جب ہم نظریات کی بات کرتے ہیں اس کا مطلب ہرگز اسے سیکولر یا سیاسی عقائد تک محدود کرنا نہیں بلکہ اس میں مذہب، ثقافت اور وہ تمام پیچیدہ اخلاقی اقدار بھی شامل کر سکتے ہیں جو کسی بھی معاشرے کا حصہ ہوتی ہیں۔ تصوّر اور مادی دنیا کے درمیان تعلق کے حوالے سے ہیگل کے نظریات خاصے پیچیدہ ہیں۔ ہیگل کے نزدیک ان دونوں کے درمیان فرق محض ظاہری

ہے۔ کائنات میں ہر کہیں تغیر وحرکت کی کارفرمائی ہے۔ کوئی بھی شے کسی دوسری شے سے الگ اپنا وجود نہیں رکھتی۔ تمام اشیا ایک دوسرے سے مربوط ومنسلک ہیں۔ ہیگل کا کہنا تھا کہ جو تغیرات ذہن میں رونما ہوتے ہیں وہی مادی عالم میں بھی وجود پذیر ہوتے ہیں۔ ہیگل کو اس بات پر یقین نہیں تھا کہ ایک مادی عالم تصورات کی تطبیق کرسکتا ہے یعنی جو کچھ ذہن میں پیدا ہوتا ہے اسی کو عملی شکل دینے کے لیے انسان جدوجہد میں مصروف ہوتا ہے۔

جن ہاتھوں نے فرانس کے انقلاب کے زمانے میں بندوق اٹھائی اور اسے حقوق کے تحفظ کے لیے استعمال کیا ان کے پس پردہ محرک نظریات ہی تھے۔ مساوات اور آزادی سے متعلق تصورات ہی نے پنپ کر انسان کو تحریک دی کہ وہ اپنے حقوق کا تحفظ یقینی بنانے کے لیے جان کی بازی بھی لگادے تو سودا برا نہیں۔

ہیگل کے بقول تمام انسانی معاملات، حتیٰ کہ تمام انسانی تاریخ اور اس سے وابستہ واقعات بھی، کی جڑیں انسانی شعور و آگہی میں کہیں پیوست ہوتی ہیں اور یہ متواتر عمل ہے۔ بقول جان کینز اگلی نسلوں کے ٹھکرائے ہوئے خیالات اور مسترد نظریات ضائع اور بیکار نہیں جاتے بلکہ وہ آنے والے مفکرین کے لیے خام مال اور ایندھن کا کردار ادا کرتے ہیں۔ شعور کی یہ کیفیت شاید دیگر سیاسی عقائد کی طرح نہایت واضح نہ ہوتا ہم بعض اوقات یہی شعوری کیفیات بڑھ کر مذہبی، اخلاقی یا محض ثقافت کی شکل وصورت اختیار کرلیتی ہے، اپنی اپنی اندرونی ساخت کے تطبیق کے لیے خارجی دنیا کی تشکیل کرتی ہے۔ گویا شعور و آگہی سبب (علت) ہے، نتیجہ نہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں حالات جاریہ (حالات حاضرہ) کی بنیاد فکری تاریخ پر ہے۔ تضاد اور حرکت زندگی کی بنیاد ہے۔ اشیا اس لیے تغیر پذیر ہوتی ہیں کہ خود ان کے بطن میں تضاد کا عنصر موجود ہے۔ ہر تبدیلی متضاد قوتوں کی کشمکش کا نتیجہ ہے۔

بعد میں آنے والے مفکرین نے تو ہیگل کے فلسفے کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کیا تاہم مارکس نے ہیگل کے فلسفے کو بالکل الٹ کر رکھ دیا اور اس کی تصوراتی ترتیب کو بھی تبدیل کردیا۔ مارکس نے مذہب، آرٹ، فلسفہ اور دیگر سماجی اقدار کے لیے جو بنیاد فراہم کی وہ تصورات پر نہیں تھیں بلکہ اس کے مطابق شعور، اقدار اور آگہی کا تعین اس زمانے کے مادّی ذرائع پیداوار کرتے ہیں۔ مارکس کا کہنا ہے کہ جو قوانین عالم مادی میں کارفرما ہیں وہی انسانی معاشرے پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہیگل کا کہنا تھا کہ جنگ تصورات کی ہے جبکہ مارکس کا کہنا ہے کہ یہ معاشرے میں موجود مختلف گروہ ہوتے ہیں جو باہم برسرپیکار ہوتے ہیں۔ اسے مارکس نے طبقاتی کشمکش کا نام دیا۔ ہیگل نے کہا تھا کہ کائنات میں ہر شے متغیر ہے اور باہم جڑی ہوئی ہیں اور یہ کہ جو کچھ ذہن کے پردے پر نمودار ہوتا ہے وہی عالمِ مادی میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تضاد اور حرکت زندگی کی بنیاد ہیں۔ اشیا اس لیے متغیر رہتی ہیں، حرکت کرتی ہیں کہ خود ان کے بطون میں تضاد کا عنصر موجود ہے۔

مارکس کا کہنا ہے کہ انسانی معاشرہ مادی قوانین کے تابع ہے۔ یہ کہہ کر اس نے تاریخی مادیت کا تصور پیش کیا اور دعویٰ کیا کہ جو تضادات عالمِ مادی کے ارتقا کا سبب بن رہے ہیں وہی معاشروں کے ارتقا کی بھی بنیاد ہیں۔ مارکس نے ہیگل کے تصورات کی جنگ کو طبقات کی کشمکش میں منتقل کردیا۔ مارکس کے بقول ہیگل کا یہ خیال غلط ہے کہ ذہن میں جو تغیرات ہوتے ہیں وہی عالم مادی میں بھی تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تصورات مادی اشیا کی پیداوار ہیں اور مادی تغیر کے ساتھ ہی تصورات بھی تبدیل ہوجاتے ہیں۔

مارکسی ورثے کی ایک بدقسمتی یہ ہے کہ ہمیں کسی بھی سیاسی اور تاریخی علامت کے لیے مادی وجوہ تلاش کرنا پڑتی ہیں اور تصورات کی طاقت کو نظرانداز کرنا پڑتا ہے۔ اس کی مثال ابھی حال ہی میں پال کینیڈی کی شائع ہونے والی کتاب ''عظیم طاقتوں کا عروج وزوال'' ہے جس میں انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عظیم طاقتوں کا زوال ان کے معاشی بوجھ کے باعث رونما ہوا۔ یہ بات ایک حد تک درست معلوم ہوتی ہے کہ کوئی بھی معیشت جو محض بقا کی حد تک کارگر ہوتا دیرا پنے ذخائر پر کس طرح بوجھ ڈالتی رہے گی لیکن ایک جدید صنعتی اور کثیر پیداواری معاشرہ جب اپنی مجموعی قومی پیداوار کا تین سے چار فیصد حصہ اپنے دفاع پر خرچ کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کی سیاسی ترجیح ہوگی جس کا فیصلہ شعوری وآگہی کی سطح پر ہوگا۔

فکر جدید کا مادی تعصب نہ صرف ان لوگوں کی سوچ سے عیاں ہے جو مارکس کے ہمدرد ہیں بلکہ بہت سے اس کے مخالف بھی اسی خیال کے علم بردار دکھائی دیتے ہیں۔ وال اسٹریٹ جرنل مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے جبری مادیت پسند تصور کی اہمیت کو یکسر نظرانداز کرتے ہیں اور انسان کو ایک باعقل اور زیادہ سے زیادہ منافع کے حصول کا خواہش مند فرد تصور کرتے ہیں اور ان کی درسی کتب میں بھی ہمیں انسان اسی طرح کا فرد نظر آتا ہے جو محض مادی آسودگی کے حصول کے لیے سرگرداں ہے۔

میکس ویبر نے اپنی کتاب The Protestant Ethic and the Spirit of Capitalism میں یورپ اور امریکا میں پروٹیسٹنٹ اور کیتھولک معاشروں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد موازنہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''پروٹیسٹنٹ کھاتے اچھا ہیں، جبکہ کیتھولک چین کی نیند سوتے ہیں۔'' ویبر نے لکھا کہ مادہ پرستانہ نظریات کے مطابق انسان کو محض منافع کا حصول میں سرگرداں فرد ظاہر کیا جاتا ہے تو پھر منافع میں اضافے یا اس کی جانب راغب کیے جانے کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ انسانی کاوشوں میں بھی اضافہ ہو اور اس کے لیے وہ زیادہ محنت کرے گا، اپنے اوقات کار میں اضافہ کرے گا تاکہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ سکے۔ ویبر نے لکھا کہ مشاہدات اور تجربات نے یہ ثابت کیا ہے کہ روایتی زرعی معاشروں میں جب مزدوروں کی اجرت میں اضافہ کیا گیا تو انہوں نے اوقات کار بڑھانے کے بجائے تفریح کے مواقع کو زیادہ وقت دینا شروع کردیا جبکہ اپنے اوقات کار وہی رکھے۔ ویبر کے مطابق تفریح کے مواقع کی تلاش اور ان کا انتخاب ان سب کی جڑیں مادہ پرست معاشی نظام کی گہرائیوں میں نہیں بلکہ تصورات اور نظریات میں پیوست ہیں۔ اگر انسان کے سامنے مادی و معاشی فوائد کے ساتھ ساتھ دیگر متبادل بھی موجود ہوں تو اس صورت میں اس کا فیصلہ کیا ہوتا ہے، خاص طور پر اس صورت میں جب اسے وہی منافع اس کے مخصوص اوقات کار میں حاصل ہو رہا ہو؟ یہ عمل ظاہر وثابت کرتا ہے کہ انسان محض منافع کے حصول ہی کے لیے سرگرداں نہیں رہتا بلکہ اپنے نظریات اور تصورات کی تسکین بھی چاہتا ہے۔

ویبر کے تھیسس کا مرکزی موضوع یہی ثابت کرتا ہے برخلاف مارکس کے، جو ان کی وجوہ پیداوار کے مادی ذرائع میں ڈھونڈتا تھا، ان تصورات اور نظریات کی جڑیں معاشرے کی تہذیبی، مذہبی اور ثقافتی اقدار سے جُڑی ہوتی ہیں اور جدید معاشیات کو سمجھنے اور منافع کے محرکات کو جاننے کے لیے ہمیں ان محرکات یعنی پیداوار کے ذرائع کی جڑیں تصورات میں تلاش کرنا ہوں گی۔

اگر ہم موجودہ دنیائے معاشیات پر نظر دوڑائیں تو ہمیں معاشی ترقی کے مادی نظریات کی مفلسی واضح نظر آئے گی۔ وال اسٹریٹ جرنل مکتبۂ فکر سے وابستہ معاشی دانشور شد و مد کے ساتھ گزشتہ دہائیوں کے دوران ایشیا میں ہونے والی ہوش

ربا معاشی ترقی کو مثال بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ آزاد تجارت کے ثمرات ہیں اور اگر تمام معاشروں میں کُھلے بازار کی معیشت کے نظریات نافذ کر دیئے جائیں اور ذاتی فوائد کے حصول کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو ہٹا لیا جائے تو وہ تمام معاشرے بھی اسی طرح ترقی کریں گے۔ یہ درست ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی ترویج و ترقی کے لیے ایک پائیدار سیاسی نظام بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن ہمیں مشرق بعید کے ان ممالک کے ثقافتی اور خاندانی نظام اور محنت و بچت کے رجحانات کو بھی سمجھنا ہوگا اور ان کے نقطہ ہائے نظر کو جاننا ہوگا۔ ان معاشروں میں کسی بھی قسم کے کاروباری انداز کو اپنانے پر کوئی قدغن نہیں جبکہ اسلام کچھ خاص طرح کے کاروباری معاملات پر پابندی عائد کرتا ہے اور سودی معاملات پر بہت سخت گیر ہے۔

مشرق بعید کے ممالک کی ترقی میں جو عوامل کارفرما ہیں ہمیں ان کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا۔ ان تمام خصائل سے جو ایک خاص معاشرہ اور معاشرتی اخلاق وجود میں آتا ہے وہ سب بھی معاشی ترقی اور اس کی وضاحت میں بنیادی اور اہم کردار ادا کرتے ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مادی تشریحات کے دوران کوئی ایک معاشی نظریہ بھی ہمیں ایسا نظر نہیں آتا جو شعور اور ثقافتی ورثے کی معاشی رویے کی تخلیق کے حوالے سے تشریح کرتے ہوں۔ معاشی رویے کی بنیاد کو شعور اور ثقافت کے تناظر میں سمجھنے میں وہی عمومی غلطی دہرائی جاتی ہے اور ان مادی وجوہ کو عام طور پر نیچر (فطرت) سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔

مغرب میں یہ روش عام ہے کہ چین اور روس میں جاری معاشی اصلاحاتی عمل کو مادی نظریات کی فتح قرار دے رہے ہیں اور تصورات پر مبنی معاشرے کے زوال پر شادیاں دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی ان کا کہنا ہے کہ نظریات و تصورات ایک اعلیٰ اور جدید پیداواری معاشیات کے قیام اور اس کے فروغ میں ناکام ہو گئے ہیں اور یہ کہ اگر کسی کو فتح یاب ہونا ہے تو پھر ذاتی فوائد کے محرکات کو اجاگر کرنا ہوگا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اشتراکی معیشتوں کی عمیق خامیاں تو تیس چالیس برس قبل ہی عیاں ہو گئی تھیں تاہم ایسا کیوں ہوا کہ ان ممالک نے ۱۹۸۰ کے عشرے میں ریاستی معاشی نظام کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا درست جواب تو ان ممالک کی اشرافیہ اور حکمرانوں کے اذہان و شعور میں کہیں ہوگا جنہوں نے پروٹیسٹنٹ کی باثروت لیکن پُرخطر طرزِ زندگی کو کیتھولک طرزِ فکر کی افلاس زدہ مگر محفوظ زندگی پر ترجیح دی۔ ان معاشی نظاموں میں تبدیلی دراصل ان کے سوچ میں تبدیلی کا نتیجہ تھی۔

ہیگل کے نظریات کے طرف داروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ شعور و تصور میں ہونے والی تبدیلی کو سمجھنے کے لیے تاریخی عمل میں ہونے والے تغیر و تبدل کو سمجھیں کیونکہ تصورات کی سطح پر ہونے والی تبدیلی مادی دنیا میں بھی ویسی ہی تبدیلی برپا کیا کرتی ہے۔

کیا ہم فی الواقع نظریاتی تاریخ کی منتہا پر ہیں؟ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ کیا انسانی زندگی میں ایسے بنیادی تضادات اب بھی موجود ہیں جنہیں جدید لبرل ازم کی روشنی میں سلجھایا نہیں جا سکا ہے اور جس کے لیے ابھی مزید کسی متبادل سیاسی، معاشی ڈھانچے کی ضرورت ہے؟ اور ہمارے مفروضات درست ہیں تو پھر اس کا جواب ہمیں نظریات و تصورات میں تلاش کرنا ہوگا۔

گزشتہ صدی کے دوران لبرل ازم کو دو چیلنجز کا سامنا رہا۔ ایک فاشزم اور دوسری اشتراکیت۔ اشتراکیت کو سیاسی ناہمواری، مادہ پرستی، اخلاقی بدحالی اور مغرب کے کمزور معاشروں کا سامنا کرنا پڑا جبکہ فاشزم دوسری جنگ عظیم کے دوران تباہی سے دوچار ہوا۔ یہ تباہی مادی سطح پر تو تھی ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے نظریاتی طور پر بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ نظریے کی حیثیت سے فاشزم کی شکست کسی عالمی اخلاقی بغاوت کا نتیجہ نہیں تھی کیونکہ بہت سے لوگ اسے اپنانا بھی چاہتے تھے کہ انہیں یہی مستقبل کی روش دکھائی دیتی تھی۔ یہ بات بہت پہلے واضح ہو چکی تھی کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جرمنی اور دیگر یورپی ممالک میں فاشزم برے انجام سے دوچار ہوگی اور یہ انجام اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔ فاشزم کی شکست کی کوئی معقول مادی وجوہ نظر نہیں آتیں اور نہ ہی اس کے دوبارہ نہ ابھرنے کے لیے کوئی مادی محرکات نظر آتے ہیں کیونکہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے اور اس کے بعد جرمنی اور جاپان کے توسیع پسند عزائم اور قوم پرستانہ جذبات اپنی تمام جاذبیت کھو چکے تھے۔

لبرل ازم کو دوسرا بڑا متبادل چیلنج اشتراکیت کی صورت درپیش تھا جو فاشزم سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ ہیگل کے نقوشِ قدم پر چلتے ہوئے کارل مارکس کہتا ہے کہ آزاد معاشرہ ایک اساسی تضاد رکھتا ہے جسے اسی تناظر میں حل نہیں کیا جا سکتا یعنی سرمایہ دار اور مزدور میں پائے جانے والے فرق اور تضاد کے درمیان ایسی کوئی تطبیق نہیں ہو سکتی جس سے مکمل ہم آہنگی پیدا ہو۔ یہی لبرل ازم پر سب سے بڑا الزام ہے۔

مغرب میں طبقاتی کشمکش کو معقول حد تک کنٹرول کر لیا گیا ہے۔ جدید امریکی معاشرے کو بہت سے اہلِ علم و فن اس حوالے سے سب سے نمایاں علامت اور مظہر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ کہنا محض مبالغہ ہوگا کہ امریکا میں امیری اور غریبی کے درمیان فرق ختم ہو چکا ہے تاہم یہ خلیج اتنی کم ضرورت ہوئی ہے کہ پُرامید رہا جا سکے۔ امریکا میں سیاہ فام آبادی کے عمومی افلاس کا بنیادی سبب معاشی ناہمواری یا آجروں کا امتیازی رویہ نہیں بلکہ اس کی جڑیں غلامی اور نسل پرستی میں پیوست ہیں۔

طبقاتی کشمکش کے خاتمے کے ساتھ ہی پہلی جنگِ عظیم کے بعد اب کہیں جا کر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ترقی یافتہ مغربی دنیا میں اشتراکیت کے لیے جاذبیت کم ہوتی جا رہی ہے اور اسے جانچنے کے کئی طریقے ہیں۔ یورپی اشتراکی ممالک میں روز بروز گرتی سیاسی مقبولیت، ان ممالک میں معاشی اصلاح کے منصوبے، امریکا کے علاوہ جاپان، جرمنی اور برطانیہ میں ایسی جماعتوں کا فتح یاب ہونا جو آزاد تجارت اور مرکزی حکومت کی عدم مداخلت کے قائل ہیں، اور ان ممالک میں ایسی دانشورانہ فضا کا قیام جس میں مفکرین اس خیال میں غلطاں نہیں رہتے کہ سرمایہ دارانہ معاشرے کو زیر کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے..... یہ سب کچھ بتاتا ہے کہ اشتراکیت عملی سطح پر اطمینان بخش حد تک قابلِ عمل نہیں۔

یہ بات قابل بحث ہے کہ شمالی بحر اوقیانوس کے ممالک کے لیے سوشلسٹ نظام کبھی متبادل کے طور پر قابل عمل نہیں تھا۔ ہاں! اس خطے سے پرے اس نظام نے کئی دہائیوں تک کامیابی سے قدم جمائے رکھے یعنی غیر یورپی ممالک میں تو اس خیال کی زیادہ پذیرائی کی گئی اور ایشیا میں خصوصی طور پر اس تصور کو زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اپنایا گیا۔ بیسویں صدی کے آغاز پر ایشیا اپنے تنوع اور ہمہ گیریت کی بدولت مغربی افکار درآمد کر رہا تھا اور اسی لیے مغربی تصورات پر مبنی سب سے زیادہ تجربے بھی یہیں کیے گئے۔

ایشیا میں لبرل ازم کو بڑے خطرات کا سامنا رہا ہے۔ ان تمام خطرات و مصائب کو آج با آسانی بھلا دیا گیا ہے جبکہ سیاسی، نظریاتی کشمکش کے مثبت نتائج سے دنیا بھرنے استفادہ کیا ہے۔ ایشیا میں لبرل ازم کے مقابلے میں سب سے پہلے فاشزم نے سر اٹھایا تاہم اسے امریکا کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا جب امریکی فوج کے گولا بارود نے جاپانی توسیع پسندانہ عزائم کا بھرکس نکال کر اسے تہس نہس کر دیا۔ فاتح امریکا

نے مفتوح جاپان پر لبرل ازم پر مبنی جمہوریت بھی نافذ کی۔ جب امریکا نے مغربی سرمایہ داری اور سیاسی آزادی کے بیج جاپانی سرزمین میں بوئے تو جاپانیوں نے اس کی اس طرح سے آبیاری کی کہ آج وہاں جمہوریت ایک تناور درخت کی صورت میں موجود ہے اور جاپانیوں کے اس طرزِ عمل کی کہیں اور مثال نہیں ملتی۔ جاپان نے امریکا کے نقوشِ قدم پر چلتے ہوئے خود کو ایک حقیقی صارف معاشرے میں تبدیل کرلیا اور کُھلے بازار کی معیشت کے اصول اپنا کر آج عالمی معیشت پر حکمرانی کر رہا ہے جاپان کی تیار کردہ مصنوعات کا اثر و رسوخ دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور لوگوں کو ان مصنوعات پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے خرید لیتے ہیں۔

وی ایس نائپال نے چند مسلم ممالک کے سفرناموں پر مشتمل ایک کتاب Among the Believers شائع کی ہے جس میں انہوں نے اس دور کا ذکر کیا ہے جب ایران میں انقلاب برپا ہوا تھا۔ اسی دور میں نائپال نے جن مسلم ممالک کا دورہ کیا اُن میں ایران بھی شامل تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جب وہ ایران کے طول و عرض میں سفر کر رہے تھے کہ انہوں نے ایک عجیب بات محسوس کی کہ ایران میں انقلاب مذہب کے نام پر آیا تھا اور انقلابیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام مغربی علامات کو مٹا دیں گے تاہم ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے جا بجا جاپانی برقی مصنوعات تیار کرنے والی کمپنیوں (سونی، ہٹاچی، جے وی سی وغیرہ) کے بڑے بڑے سائن بورڈ اور اشتہار دیکھے جنہیں کسی نے چُھوا تک نہیں تھا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ جاپانی مصنوعات کی مانگ اتنی زبردست تھی کہ ایرانی حکومت بھی فوری طور پر انہیں ختم نہیں کرسکی تھی۔

جاپان کی اسی کامیابی کی بدولت ایشیا میں کُھلے بازار کی معیشت پر مبنی نظام کو اپنانے کی تحریک نے زور پکڑا۔ اس معاشی نظام کے قیام کے لیے ایک ایسا سیاسی نظام درکار تھا جو مساوات اور مکمل آزادی پر مبنی ہو۔ جن ممالک نے آزاد منڈی کی معیشت کو اپنانے کا فیصلہ وہاں آزاد سیاسی نظام کی راہ بھی ہموار ہوئی۔ یوں مغرب کے لبرل ڈیموکریسی کے ماڈل نے دنیا بھر میں فروغ پایا۔ جاپان کی پیروی کرتے ہوئے بیشتر ایشیائی ممالک نے معاشی و سیاسی ترقی کی منازل طے کیں۔ لبرل معاشی نظام کو اپنانے کے لیے لبرل جمہوریت کو اپنانا بھی ناگزیر ہو چکا تا۔ ایشیا کے بیشتر حکمرانوں کو اپنے بے حیثیت ہو جانے کا خوف لاحق تھا اس لیے لبرل جمہوریت کے فروغ کا عمل سست رہا۔

جنوبی کوریا نے ایک جدید شہری معاشرے کے طور پر ایشیائی خطے میں سر ابھارا۔ اس کی ترقی میں اس کی مڈل کلاس نے فعال کردار ادا کیا تھا۔ تبدیلی کے اس عمل میں وہ لوگ گردو پیش ہونے والے معاشی تغیر و سیاسی تبدل سے کیونکر بے بہرہ اور بے خبر رہ سکتے تھے اور سیاسی شعور کی بدولت وہ کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ ان پر ایک فوجی حکمران مسلط ہو۔ ایسے میں جمہوریت کا قیام ناگزیر تھا۔ برما (میانمار) کی مثال بھی نمایاں ہے۔ وہاں فوجی حکومت رہی ہے مگر عالمی سطح پر دباؤ بھی بڑھتا رہا ہے کہ سیاسی و معاشی اصلاحات کی راہ ہموار کی جائے اور آزاد منڈی کی معیشت کے ساتھ ساتھ لبرل جمہوریت بھی اپنائی جائے۔ میانمار کا ایک افسر جب طبی معائنے کے لیے سنگاپور گیا تو وہاں کی ترقی دیکھ کر رو پڑا کیونکہ اُسے اپنے ملک کی پس ماندگی کا بہت شدت سے احساس ہوا۔

سب سے اہم موضوع تو یہ ہے کہ آزاد تجارت کا نظام اور لبرل جمہوریت اپنی ساری جاذبیت کھو بیٹھتے ہیں اگر وہ ایشیا کی قدیم ترین تہذیب کے حامل چین کو متاثر نہ کرسکیں۔ جسیم و ضخیم چین ایک متبادل کے طور پر ابھر سکتا ہے جو لبرل جمہوریت پر مبنی سیاسی و معاشی نظام کے لیے خطرہ ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ اب چین میں بھی تبدیلی آرہی ہے۔ چین میں معاشی اصلاحات کا آغاز ہو چکا ہے۔ زراعت کو ریاستی نظم سے الگ کیا جارہا ہے۔ حکومت اپنے آپ کو صرف محصولات کی تحصیل تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ ان اصلاحات کا نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ پانچ برسوں کے دوران چین میں اناج کی پیداوار دگنی ہوگئی ہے۔ اس عمل سے چین کے کسانوں کو ایک عالمی مساوی نظام پر مبنی لبرل جمہوریت کی جھلک دیکھنے کو ملی ہے۔ اس کے نتیجے میں حکمرانوں کو حوصلہ بھی ملا ہے کہ وہ اصلاحاتی عمل کو معیشت کے دیگر شعبوں میں بھی متعارف کرائیں۔ فی الحال ہم چین کو کسی بھی طور لبرل ازم کی طرف تیزی سے بڑھتا ہوا ملک قرار نہیں دے سکتے۔ فی الحال اُس کی معیشت کا صرف ۲۰ فیصد ریاستی نظم سے باہر ہے۔ سیاسی نظام پر تو اب بھی ایک ہی جماعت متصرف ہے۔

چین میں اب تک کسی بھی رہنما نے گورباچوف کی طرح ہمت کا مظاہرہ نہیں کیا اور کسی بھی حقیقی معاشی اصلاحی منصوبے کا اعلان کیا ہے نہ وعدہ۔ وہاں آج بھی کارل مارکس اور ولادیمیر لینن پر شدید تنقید ہی دکھائی دیتی ہے۔ چین میں ابھرنے والا ٹیکنو کریٹس کا نیا طبقہ، جو دولت مند بھی ہے، اچھی طرح جانتا ہے کہ مارکس اور لینن کے نظریات درحقیقت اب چین کی معاشی سمت کے لیے راہ نمائی کا کام نہیں دیتے تاہم کوئی اور متبادل نہ ہونے کے باعث فی الحال انہیں اپنائے رہنے کے سوا چارہ بھی نہیں۔

چین میں صرف کارِ رجحان تیزی سے پنپ رہا ہے جو کے ذریعے معیشت بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اشتراکی انقلاب کے برپا ہونے کے بعد صرف کے رجحان کا پنپنا چین میں سب سے بڑی تبدیلی ہے اور اس تبدیلی نے مزید بہت سی تبدیلیوں کی راہ ہموار کی ہے۔

جیسے جیسے چین کے دروازے بیرونی دنیا کے لیے کھلتے جارہے ہیں، گو قدرے سست رفتاری کے ساتھ ہی سہی، ویسے ویسے وہاں سیاسی شعور بھی بڑھ رہا ہے تاہم چین حکومت نے بڑی عمیق نگاہیں اس سارے عمل پر گاڑ رکھی ہیں اور سیاسی محاذ پر کسی بھی آواز کو سختی سے دبا دیا جاتا ہے اور ہمیں آئے دن کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ سننے یا پڑھنے کو مل جاتا ہے۔

چین ایک طرف تو معاشی اصلاحات کو اپنے ماحول اور ضرورت کے مطابق ڈھال رہا ہے تاہم دوسری طرف سیاسی حوالے سے وہاں بالکل خاموشی ہے۔ پھر بھی عوامی سطح پر لبرل خیالات زور پکڑ رہے ہیں کیونکہ جب معیشت باہر کی دنیا کے لیے کُھل گئی ہے اور لوگوں کے رابطے باہر کی دنیا سے بڑھ بھی رہے ہیں تو پھر سیاسی خیالات اور نظریات بھی سفر کرتے ہوئے چین کی سرحدی حدود کو عبور کر رہے ہیں، چینیوں کے ذہنوں میں سرایت کر رہے ہیں۔

اس وقت ۲۰ ہزار سے زائد نوجوان چینی امریکا اور دیگر یورپی ممالک کی جامعات میں زیرِ تعلیم ہیں۔ ان میں اکثریت کے والدین دولت مند چینی ہیں۔ یہ لوگ یہاں نہ صرف تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور مغربی معاشروں کو بہت قریب سے دیکھ بھی رہے ہیں، بلکہ براہ راست بہت سے تجربات سے گزر رہے ہیں۔ جب یہ بچے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وطن واپس جا کر انتظامی معاملات کا حصہ بنیں گے تو یہ احساس انہیں شدید اضطراب سے دوچار کرے گا کہ چین اس خطے کا واحد ملک ہے جہاں جمہوریت پسندی اب تک بھرپور طریقے سے پروان نہیں چڑھ سکی ہے۔

عالمی تاریخ کے نقطۂ نظر سے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ چین میں جاری اصلاحاتی عمل یا اس کے مستقبل کے حوالے سے کیا رجحانات ہیں بلکہ یہ ہے کہ چین دنیا بھر میں اب ان لبرل قوتوں کے لیے مشعلِ راہ نہیں رہا چاہے وہ قوتیں ایشیا کے کسی ملک کے جنگلات میں حکومت کے خلاف نبرد آزما ہوں یا پھر میں پیرس میں جدوجہد کرنے والی مڈل کلاس۔ چین کے موجودہ سیاسی نظریات اب کسی اور ہی دنیا کا

خیال معلوم ہوتے ہیں۔ چین میں ہونے والی معاشی تبدیلیاں اپنی جگہ، تاہم روس میں ہونے والا تغیر تو گویا مارکس ازم کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا ہے۔

اگر ہم فرض کرلیں کہ لبرل ازم کو درپیش دو خطرات یعنی فسطائیت اور اشتراکیت کا خاتمہ ہو چکا ہے تو کیا اب بھی کوئی نظریاتی حریف ہے جو لبرل ازم کے مقابل موجود ہو؟ یا یوں کہا جائے کہ لبرل سوسائٹی میں سوائے طبقاتی فرق کے، کیا کوئی اور بھی ایسا مسئلہ ہے جو ہنوز لاینحل ہے؟ اس کے جواب میں ہمیں دو ممکنہ خطرات نظر آتے ہیں.....یعنی مذہب اور قوم پرستی۔

ان میں سے اگر مذہب کا ذکر کریں تو گزشتہ چند برسوں کے دوران عیسائیت، یہودیت اور اسلام میں انتہا پسندی مسلسل بڑھتی ہوئی نظر آ رہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مغرب کے آزاد، صارف معاشروں میں موجود مذہبی اور روحانی خلا کے باعث یہ لوگوں کو شدید ردِعمل جو شدت اختیار کر رہا ہے۔ لبرل ازم کی اساس میں موجود خلا یقیناً اس نظریے کی خامی کہی جا سکتی تھی تاہم اس خلا کو مذہب کسی صورت پُر نہیں کر سکتا۔ اس خامی یا کجی کا حل بھی سیاسی عمل میں ہے۔ خود جدید لبرل ازم، مذہب کی بنیاد پر قائم معاشروں کی کمزوریوں کے باعث، تاریخی ردعمل کے طور پر معرضِ وجود میں آیا ہے۔

آج کی دنیا میں صرف اسلام مذہبی ریاستی نظام پیش کرتا ہے جو نہ صرف جدید لبرل ازم بلکہ اشتراکیت کا متبادل ہونے کا بھی دعویدار ہے تاہم اس کے اصول غیر مسلموں کے لیے زیادہ جاذبیت حاصل نہیں کر سکے ہیں اور یہ بھی بعید از امکان ہے کہ یہ کبھی عالمگیر تحریک کی شکل اختیار کر سکے گا۔ دیگر مذاہب لبرل معاشروں میں ذاتی زندگی میں نفوذ کی حد تک کامیابی سے حلول کر چکے ہیں۔

تیسری دنیا کا بڑا حصہ تاریخ میں مستغرق اور آنے والے کئی برسوں تک تنازعات کی آماجگاہ بنا رہے گا۔ ہم اپنی توجہ بڑی اور ترقی یافتہ ریاستوں پر مبذول کرتے ہیں۔ مستقبل قریب میں تو اس بات کا امکان نظر نہیں آتا کہ روس اور چین مغرب کے ترقی یافتہ ممالک سے الحاق کریں گے یا ان میں شامل ہوں گے لیکن فرض کریں کہ ان ممالک کی خارجہ پالیسیوں سے مارکسی عوامل کا خاتمہ ہو جائے تو پھر تاریخ کے ایسے فرضی موڑ پر اس دنیا میں جو نظریات سے تہی ہو جائے اور ہماری دنیا میں کیا فرق رہ جائے گا؟ اس کا ایک عام جواب تو یہ ہے کہ شاید کچھ زیادہ نہیں کیونکہ عام طور بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین کے درمیان یہ خیال وسیع پیمانے پر رائج ہے کہ تمام بڑی طاقتوں کے نظریات کے پس پردہ دراصل قومی مفادات کارفرما ہوتے ہیں جس کے باعث قوموں کے درمیان اعلیٰ پیمانے پر مسابقت اور مناقشت جاری رہتی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے ایک مکتبۂ فکر کے مطابق تنازع بین الاقوامی نظام کا قدرتی جُز ہے اور تنازعات کے امکانات کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ نظام کے خدوخال کو دیکھا جائے۔ مثلاً کوئی بھی بین الاقوامی سیاسی تنازع ہو تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ سیاسی نظام یک قطبی دنیا سے ملحق ہے کثیر قطبی دنیا سے۔

دراصل یہ سیاسی مکتبۂ فکر ٹامس ہوبز کے نظریات کے تناظر بین الاقوامی سیاسی تعلقات کو دیکھتا ہے جس کے مطابق انسانی معاشروں میں پایا جانے والا جارحیت اور عدم تحفظ کا احساس مخصوص تاریخی و سیاسی حالات و واقعات کی پیداوار نہیں بلکہ ان کی حیثیت عالمگیر ہے۔ (تلخیص و ترجمہ: تنزیل الرحمٰن)

"The end of history". ("www.jstor.org".)

●●●

بقیہ: صلاحیت کے حصول میں کون آگے؟

دنیا بھر میں معیشتیں خصوصی زون قائم کر رہی ہیں۔ درآمد شدہ افرادی قوت سے کماحقہٗ مستفید ہونے کے لیے بڑے شہروں میں ایسے علاقے قائم کیے جا رہے ہیں، جن میں صنعتیں اور مالیاتی ادارے یکجا کر دیے جائیں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ کام کیا جا سکے۔ اس حوالے نئے، بارآور قوانین اور قواعد و ضوابط وضع کرنے پر بھی زور دیا جائے گا تاکہ باصلاحیت نوجوانوں سے زیادہ سے زیادہ اور بہتر کام لیا جا سکے۔

ڈورس سوہمن پاؤ مزید کہتی ہیں کہ ''ہم عالمگیریت کے اگلے مرحلے میں ہیں۔ دنیا کو زیادہ سے زیادہ مساوی بنانا تمام ہوشمند حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ پورے کرۂ ارض کا سوچنا ہے۔ باصلاحیت نوجوانوں کو بہتر مواقع ملنے چاہئیں''۔

جی ٹی سی آئی رپورٹ کے شریک مرتب برونو لینوِن کہتے ہیں کہ ''بہترین مناسبت اور مطابقت رکھنے والے باصلاحیت نوجوانوں کو پنپنے کا موقع ملنا ہی چاہیے۔ اس حوالے سے جامع، شفاف پالیسیاں مرتب کی جانی چاہئیں۔

تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں ایک نئی عادت بھی تیزی سے ابھر رہی ہے۔ یہ عادت نیا سیکھنے اور سیکھے ہوئے کو بہتر بنانے کی ہے۔ ہر ملک چاہتا ہے کہ اُس کی افرادی قوت زیادہ سے زیادہ مہارت کی حامل ہو۔ نئی نسل کو اسی لیے ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ وہ نیا سیکھتی ہے اور سیکھے ہوئے کا گراف بلند کرتی ہے۔ (ترجمہ: ابوالحسن اجمیری)

"Which countries attract more talent? European regions dominate the top 25". ("euronews.com". Dec 28, 2023)

بقیہ: افغانستان میں امریکا کی ضرورت

کو تنہا محسوس کرتے رہیں گے اور وہ وہاں ایسی کوئی تبدیلیاں نہیں لاسکیں گے، جو صرف وہی لا سکتے ہیں۔

یہ بھی ایک مثبت اقدام ہوگا اگر مغربی حکام اپنے سرکاری بیانات میں محض جذبات کو بھڑکانے کے بجائے آگے کی سمت میں کوئی پیش رفت اور کارکردگی دکھانے کا راستہ نکالیں۔ امریکی فنڈ افغانستان میں کس طرح استعمال کیے جا رہے ہیں، ان کے بارے میں اپریل میں امریکی کانگریس کے ساتھ ایک خطاب میں امریکی انسپکٹر جنرل برائے افغانستان تعمیرِ نو جان سپوکو نے بتایا تھا کہ ''میں آپ کو صرف اتنا ہی بتانا چاہوں گا کہ میں نے وہاں ٹی وی سکرین پر کسی طالبان جنگجو کو بھوک اور قحط سے موت کے منہ میں جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ وہ سب موٹے تازے اور خوش دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے بہت سے بھوکے افغان بچوں کو ٹی وی پر دیکھا ہے۔ اس لیے میں حیران اور پریشان ہوں کہ یہ ساری فنڈنگ کہاں جا رہی ہے''۔ جب مسٹر سپوکو کی یہ تشویش اپنی جگہ جائز اور بجا ہے کہ امریکی فنڈنگ اس وقت کہاں خرچ ہو رہی ہے تو اس قسم کا تاثر کسی کے بھی مفاد میں نہیں ہے۔ طالبان تحریک ایک ایسی تحریک ہے جو اپنے مذہبی جوش وجذبے سے پہچانی جاتی ہے جس کی جڑیں افغانستان کے دیہاتی اور قبائلی معاشرے میں بہت گہری پیوست ہیں۔ پورے افغانستان میں انہیں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اسی طرح غیر پیداواری سمتوں میں احترام کی کمی بھی اتنی ہی زیادہ محسوس کی جاتی ہے۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اس وقت افغانستان میں برسرِ اقتدار طالبان بھی افغان سماج کا جزو لاینفک ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں ہے کہ تمام افغان شہری لڑکیوں کی تعلیم پر پابندیوں اور خواتین کے لیے عملی زندگی میں شراکت پر بندشوں کی حمایت کرتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مفہوم بھی ہرگز نہیں ہے کہ اس مسئلے کے حل کی خاطر آگے بڑھنے کے لیے کسی بہت گہرے ادراک کی ضرورت ہے، اس کے لیے تکبر سے پاک اور ایک دیسی افغان حل ہی مفید ثابت ہوگا۔ آپ میری یہ بات پسند کریں یا نہ کریں اس کا حل یہی ہے کہ امریکا اور اس کے اتحادی جلد از جلد افغانستان کے امن و ترقی کے عمل میں واپس شامل ہو جائیں۔

"It's time for America to go back to Afghanistan". ("The New York Times". Jan 3, 2024)

●●●

ایران امریکا پراکسی جنگ

David E. Sanger, Julian E. Barnes, Vivian Yee & Alissa J. Rubin

سب کو ڈر تھا کہ مشرقِ وسطیٰ میں ایک نئی جنگ شروع ہونے والی ہے جو امریکا، اسرائیل اور ایران کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ اس تنازع کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ براہِ راست تصادم سے بچنے کے لیے ایران اور امریکا نے غیر معمولی احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے۔ امریکی اور یورپی سفارت کاروں کا کہنا ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ جنگ کب تک جاری رہے گی۔ لیکن اہم فریقوں کا خیال ہے کہ ایران نے اپنی پراکسی وار کے ذریعے امریکی فوج کو مشکلات میں دھکیل دیا ہے۔ مغرب اور اسرائیل کی بحیرۂ احمر سے گزرنے والی شپنگ کمپنیوں کو شدید دباؤ میں پھنسا دیا ہے لیکن ساتھ یہ احتیاط بھی کی ہے کہ جنگ زیادہ بڑے پیمانے تک نہ پھیلے۔ دوسری جانب ایران نے اپنے ہاں یورینیم کی افزودگی اور پیداوار کو اس سطح تک بڑھا دیا ہے جس کی مدد سے ایٹمی ہتھیار بنانے کی صلاحیت حاصل ہو جائے تاہم اسے اس ممکنہ معیار سے قدرے نیچے ہی رکھا ہے تاکہ اسے بم گریڈ جوہری ایندھن قرار دیا جائے۔ جب اسرائیل نے حماس کے ایک لیڈر کو شہید کرنے کے لیے جنوبی لبنان پر حملہ کیا تو اس نے قریب موجود حزب اللہ کے جنگجوؤں پر کسی قسم کا حملہ کرنے سے گریز کیا۔ اس سے اسرائیلی حکام نے حزب اللہ پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ اسے حماس سے بدلہ لینے کے لیے جنوبی لبنان کی سرحدوں پر کشیدگی میں اضافہ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، لیکن اس کے صرف چھ دن بعد ہی اس نے حزب اللہ کی ایلیٹ فورس کے کمانڈر وصام حسن طاول کو نشانہ بنایا جو حزب اللہ کے سینئر ترین کمانڈر تھے۔

جب امریکا نے حوثی باغیوں کی یمن میں تنصیبات، راڈار اور اسلحہ ڈپوؤں پر گزشتہ ہفتے حملہ کیا تھا تو اس نے یہ حملہ رات کے اندھیرے میں کیا تھا، جس سے امریکا نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اس کا حوثی قیادت پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن انہیں مجبوری میں ایسا کرنا پڑا، تاہم ایک سابق امریکی سفارت کار ریان سی کراکر کے مطابق یہ تو ہوسکتا ہے کہ ایران مشرقِ وسطیٰ میں ہلچل پیدا کردے لیکن ایک مکمل جنگ اس کے مفاد میں نہیں ہے، جس کی قیادت کی پوری کوشش ہے کہ ایران میں ایک مستحکم حکومت برقرار رہے۔ امریکی حکومت نے بھی پوری کوشش کی ہے کہ یہ کشیدگی ایک حد سے آگے نہ بڑھے۔ لیکن تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جب امریکی فوج کو آدھی دنیا دور تنازع میں ملوث ہونے سے روکنے میں بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ۱۹۱۷ء میں پہلی جنگ عظیم کی صورتحال ہو یا ۱۹۴۱ء میں دوسری جنگ عظیم کے حالات ہوں، ۱۹۵۰ء میں کوریا کا بحران ہو یا ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ویت نام جنگ ہو۔ حادثات ہوں یا کسی لیڈر کا قتل، کسی بحری جہاز کا ڈوبنا ہو یا گائیڈنس سسٹم میں رونما ہونے والی کوئی خرابی ہو، انتہائی محتاط طریقے سے وضع کی جانے والی جنگی حکمت عملی بھی سنگین نتائج اور شدید نقصان کا باعث بنتی رہی ہے۔ تاہم آج سے دو سال قبل یوکرین میں شروع ہونے والی جنگ کے دوران ایسی ہی احتیاط کی پالیسی نے مثبت نتائج دیے ہیں، جن پر صدر بائیڈن کے قریب ترین مشیر بھی حیرت زدہ ہو گئے۔ حالانکہ انہوں نے ابتدا میں یہ ہدایات جاری کردی تھیں کہ امریکی فوج کو جنگ میں براہِ راست ملوث کرنے کے علاوہ یوکرین کو روس کے خلاف حمایت کرنے کے لیے جو کچھ بھی ممکن ہے، وہ کیا جائے۔ انہوں نے یہ ہدایات بھی جاری کر دیں کہ یوکرین روسی سرزمین پر کسی بھی جنگی کارروائی میں امریکی اسلحہ استعمال نہیں کرے گا جبکہ یہ تشویش مسلسل رہی کہ اگر کسی روسی میزائل نے نیٹو کے کسی رکن ملک کی سرزمین کو ہٹ کر دیا تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے گا۔ جہاں کیوبا کا میزائل بحران پیدا ہونے کے بعد روس اور امریکا ۸۰ سال کی سرد جنگ کے سگنل بھیجنے کی تاریخ رکھتے ہیں جس کے بعد ہی دونوں ممالک کے درمیان ہاٹ لائن رابطوں کا سسٹم قائم کر دیا گیا تھا۔ لیکن ایران کے معاملے میں نہ ایسی کوئی تاریخ ہے اور نہ براہِ راست رابطے قائم ہیں کہ یہ یقین دہانی ہو کہ کنٹرول میں رہنے والی صورتحال آئندہ بھی قابو میں رہے گی۔ امریکی انٹیلی جنس حکام اپنے انٹرویوز میں یہ دعوے کر رہے ہیں کہ ان کے خیال میں ایران نے اگرچہ حوثی باغیوں کی بحیرۂ احمر سے گزرنے والے بحری جہازوں پر حملوں کی حوصلہ افزائی کی ہے مگر وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جنگ بڑے پیمانے پر پھیل جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان پراکسی جنگوں کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اسرائیل اور امریکا کے لیے مشکلات پیدا ہوں۔

انٹیلی جنس حکام کا یہ بھی کہنا ہے کہ ابھی تک کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا کہ القدس فورس کے کمانڈر یا ایران کے سپریم لیڈر نے حوثی باغیوں کو بحیرۂ احمر سے گزرنے والے بحری جہازوں پر حملے کرنے کے لیے کہا ہو۔ لیکن اس وقت سوال یہ نہیں ہے کہ ایران نے حوثی اقدامات کو سپورٹ کیا ہے یا نہیں۔ انٹیلی جنس حکام کا دعویٰ ہے کہ ایرانی حکام یہ سمجھتے ہیں کہ کشیدگی میں اضافے سے مغربی ممالک کو ہونے والے نقصان میں اضافہ تو ہوگا مگر کسی بڑی جنگ شروع ہونے کا خدشہ نہیں ہوگا۔

ریان سی کراکر کہتے ہیں کہ ایسے حالات میں اہم سوال یہ ہے کہ ان پراکسی جنگوں میں ایران کس حد تک ملوث ہے اور کس حد تک یہ مقامی عناصر کے اپنے اقدامات ہیں۔ مسٹر کراکر یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ایرانی سپریم لیڈر اپنے پیشرو کے مقابلے میں خطے کی صورتحال کو متاثر کرنے کے حوالے سے زیادہ گرفت رکھتے ہیں لیکن ان کے سامنے بھی یہی سوال ہے کہ وہ حالات پر براہِ راست کتنی گرفت رکھتے ہیں۔ سفارت کاروں کا کہنا ہے کہ اسرائیل کی سخت گیر حکومت کے مقابلے میں امریکی حکومت کو زیادہ تشویش ہے کہ کشیدگی قابو سے باہر نہ ہو جائے۔ لندن میں قائم ایک ریسرچ تنظیم چیتھم ہاؤس میں ایرانی امور کی ماہر صنم وکیل کہتی ہیں کہ ''ایران نے پوری کوشش کی ہے کہ یہ تنازع عالمی نوعیت اختیار کر جائے۔ ایران کی ریڈ لائن اس کے بارڈرز ہیں۔ اس مرحلے پر وہ خطے میں جوا کھیلنے کے لیے تو تیار ہے مگر اپنی سرحدوں کے اندر نہیں''۔ لیکن سفارت کاروں کا کہنا ہے کہ اگر اس جنگ میں امریکی فوجی مارے گئے تو امریکا پر یہ دباؤ بڑھ جائے گا کہ وہ براہِ راست ایران پر حملہ کردے۔

"U.S. and Iran battle through proxies, warily avoiding each other".
("The New York Times". Jan 17, 2024)

بقیہ: مصنوعی ذہانت

مصنوعی ذہانت کا چیلنج کسی بھی اعتبار سے ایسا نہیں کہ نظرانداز کردیا جائے۔ اس سے صرفِ نظر معاملات کو مزید خرابی کی طرف لے جاسکتا ہے۔ جو افراد اور قومیں ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئی ہیں، اُن کے پاس تیزی سے قدم بڑھانے کے سوا چارہ نہیں۔ پاکستان جیسے کسی بھی ملک کے لیے مصنوعی ذہانت سے موثر طور پر نپٹنا زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ تاخیر کی گنجائش ہے نہ تساہل کی۔ جو کچھ بھی کرنا ہے، وہ بروقت اور بھرپور انداز سے کرنا ہے۔ کہیں کوئی کسر چھوڑنی نہیں ہے۔ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔ مصنوعی ذہانت ہر شعبے میں پنجے گاڑ چکی ہے اور یہ ''کارنامہ'' بھی ہمارے ہی ہاتھوں ہوا ہے۔ اب بچ نکلنے کی صورت بھی ہم ہی کو نکالنی ہے۔

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950